انتخابِ
آتشؔ
و
غالبؔ

انتخاب
آتش و غالب

از

برج نرائن چکبست

○

مرتبہ

کالیداس گپتا رضا

ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی

تاریخِ اشاعت : مارچ ۱۹۸۰ء

ناشر : ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، بمبئی
آفس نمبر ۲۳۲،
"پنچ رتنا"
اوپیرا ہاؤس،
بمبئی ۴۰۰۰۰۴

قیمت : تیس روپے (RS. 30/=)

پرنٹر : وی۔ رائے نے
ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی کے لیے
اجمل پریس، پرنسس بلڈنگ، جے جے ہسپتال بمبئی ۳
سے چھپوا کر شائع کیا۔

ترتیب

عرضِ حال

پنڈت برج نرائن چکبست خود ایک مایۂ ناز ہویب اور شاعر تھے۔ اگر میر، غالب، انیس، اقبال کو روایتی درجہ بندی سے بالا مان کر مقابلے میں شامل نہ کیا جائے تو چکبست کو اُردو کے درجۂ اوّل کے شاعروں میں جگہ دی جائے گی۔ ابھی مارچ ۱۹۷۰ء میں کلکتہ جاتے ہوئے میں دو روز کے لیے الٰہ آباد ٹھہرا تو ایک نجی صحبت میں احباب میں سے کسی نے کہا کہ چکبست کو زیادہ سے زیادہ صرف درجہ دوم کے شاعروں میں ممتاز کہہ سکتے ہیں۔ میں چپ ہو رہا۔ تھوڑی دیر میں مجھے فراق صاحب سے ملنا تھا۔ ڈاکٹر گیان چند میرے رہنما تھے۔ چند باتوں کے بعد فراق صاحب سے میں نے پوچھا کہ آپ ایک طرح سے چکبست کے ہمعصر رہے ہیں چکبست کی شاعری سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ چھوٹتے ہی فرمایا "میری نظر میں چکبست صفِ اوّل کے سخنور اور سخن شناس تھے"۔

ماہنامہ صبحِ اُمید، (لکھنؤ) کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں نکلا۔ چکبست اس کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے اس میں ایک نوٹ "عطر سخن" کے عنوان سے لکھا جس میں انھوں نے اعلان کیا کہ قدیم مذاقِ سخن کی یاد تازہ رکھنے کی غرض سے صبحِ اُمید میں ہر ماہ قدیم شعرا کے کلام کا انتخاب شائع ہوا کرے گا اور کہ مکمل ہونے پر یہ انتخاب مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے گا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ چکبست غزل میں غالب اور آتش سے اور مسدس میں انیس سے متاثر تھے۔ نفسِ مضمون اور مطالب و معانی پر نہیں مگر اُن کے طرزِ کلام پر اِن تینوں اساتذہ کی چھاپ موجود ہے چنانچہ انتخابِ کلام کے لیے چکبست نے سب سے پہلے آتش اور غالب ہی کو منتخب کیا۔ یہ انتخاب کم از کم جنوری ۱۹۲۱ء تک نکلتا رہا۔ ایک دو شماروں میں انتخاب دیا ہی نہیں جا سکا۔ ایک دو میں صرف آتش یا صرف غالب ہی کے کلام کا انتخاب ملتا ہے، تاہم بیشتر شماروں میں دونوں کا انتخاب باقاعدگی سے شامل ہے۔

میری نظر سے چار پانچ شماروں کو چھوڑ کر جو دستیاب نہیں ہو سکے اکتوبر ۱۹۱۸ء تا مارچ ۱۹۲۱ء کے تمام شمارے گزرے ہیں۔ میرا قیاس ہے کہ مارچ ۱۹۲۱ء کا شمارہ

صبحِ اُمید کا آخری شمارہ ہے کیونکہ اس کے بعد کا کوئی شمارہ باوجود انتہائی کوشش کے نہیں مل سکا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں اس قیاس میں قطعی غلط ثابت ہو سکتا ہوں۔

انتخاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ چکبست نے ان ۳۰ شماروں میں غالبؔ کا قریب قریب سارا متداول کلام کھنگال ڈالا ہے۔ اگر اس منتخب کلام میں سے کچھ میرے ہاتھ نہیں لگ سکا تو یہ میری کوتاہ دستی ہے۔ آتشؔ کا کلیات دو دیوانوں پر مشتمل ہے۔ پہلا دیوان ضخیم ہے اور دوسرے دیوان کا حجم پہلے دیوان کے ایک چوتھائی سے بھی کم ہے۔ چکبستؔ آتشؔ کے پہلے دیوان کا انتخاب تقریباً مکمل کر چکے تھے مگر دوسرے دیوان تک نہیں پہنچ سکے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں چکبستؔ کی خواہش تھی کہ مکمل ہونے پر یہ انتخاب مجموعہ کی شکل میں شائع ہو، مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ اس کے شاید دو سبب ہیں اوّل یہ کہ چکبستؔ کے ذہن میں ابھی اور انتخاب کرنا باقی تھا۔ دوّم چکبستؔ کا بے وقت انتقال۔

اب جبکہ میں نے چکبستؔ پر تا حدِّ امکان کام مکمل کرنے کا منصوبہ ہاتھ میں لے رکھا ہے، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ چکبستؔ کا انتخابِ کلامِ آتشؔ و غالبؔ جتنا بھی میسّر آ سکا شائع کر دیا جائے۔ اتفاق سے اس انتخاب پر چکبستؔ کے خیالات "صبحِ امید" کے اکتوبر ۱۹۱۸ء کے شمارے میں موجود ہیں۔ میں نے آخری سطروں میں بہت معمولی ردّ و بدل سے قطع نظر ان خیالات کو جوں کا توں دیباچے کے طور پر شامل کر لیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ایک برگزیدہ شاعر کا کیا ہوا دو نہایت برگزیدہ شاعروں کے کلام کا انتخاب اہلِ ذوق کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔

کالیداس گپتا رضاؔ
(۲۶ جنوری ۱۹۸۰ء)

A-43 جلدرشن
نہ پی۔ این۔ سی روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۳۶

لہ "چکبستؔ اور باقیاتِ چکبستؔ" ص ۱۴۹

دیباچہ

(از برج نرائن چکبست لکھنوی)

مغربی تہذیب و تربیت کے اثر سے ہمارے خیالات کا مرکز زبان اور شاعری کے متعلق بھی بدل گیا ہے مگر جس طرح اکثر پولیٹیکل اور سوشیل معرکہ آرائیوں کے طوفان میں تہذیب مغربی کے اصل اصول نظر انداز ہو جاتے ہیں اور محض نمائشی تقلید کی چمک دمک منزلِ مقصود کا چراغ سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح شعر و سخن کے عالم میں بھی ہمارے اکثر تعلیم یافتہ اہلِ وطن یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ محض نئے خیالات و جذبات کو نظم کرنا اصل جوہر شاعری ہے اور پرانے رنگ کے شاعر اس لیے قابلِ ترک ہیں کہ اُن کے کلام میں آزادی، وطن پرستی وغیرہ کی امنگوں کا پتا نہیں ملتا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ پرانے رنگ کے اردو شاعروں کے کلام میں تصنع اور آورد کا عیب موجود ہے مگر ان کے کلام میں جس قدر حصہ اس عیب سے پاک ہے وہ اصلی شاعری کی تصویر ہے۔ وہ اپنے کلام میں اُسی زمانے کے خیالات نظم کرتے ہیں جس میں کہ انہوں نے آنکھیں کھولیں اور نشو و نما پائی۔ بیسویں صدی کے خیالات کا نمونہ ان کی شاعری میں نہیں مل سکتا مگر ان کے برے بھلے خیالات جذبات کے سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں اور زبان کے جادو سے الفاظ کے پردے میں بجلی کی طرح چمکتے ہیں۔ یہی جوہر شاعری ہے۔ چونکہ اب زمانے کا رنگ بدل گیا ہے اور پرانی تہذیب کے یادگار نشانات مٹتے جاتے ہیں۔ لہٰذا قدیم مذاقِ فن کی یاد تازہ رکھنے کی غرض سے اور نیز اس خیال سے کہ سچی شاعری کی تصویریں عزیزانِ وطن کی غفلت اور ناواقفیت کے پردہ میں ہمیشہ کے لیے بند نہ ہو جائیں یہ انتظام کیا گیا ہے کہ قدیم شعرا کے کلام کا انتخاب شائع کیا جائے۔ اس انتخاب میں یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے کہ اُسی رنگ کے اشعار چنے جائیں جو کہ سادگی اور پاکیزگی کے جوہر سے خالی نہیں ہیں، اور مذاقِ سلیم کی قدردانی کے محتاج ہیں۔

انتخابِ آتش

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اِس قطرے کو دریا کی جُدائی کا
اسیر اے دوست! تیرے عاشق و معشوق دونوں ہیں
گرفتار آہنی زنجیر کا یہ، وہ طلائی کا
تعلق رُوح سے مجھکو جسَد کا ناگوارا ہے
زمانے میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا
نظر آتی ہیں ہرسُو صورتیں ہی صورتیں مجھکو
کوئی آئینہ خانہ، کارخانہ ہے خدائی کا

نکل اے جان! تن سے، تا وصالِ یار حاصل ہو
چمن کی سیر ہے انجام بلبل کو رہائی کا
دکھایا حُسن سے اعجازِ موسیٰ کلکِ قدرت نے
یدِ بیضا بنایا پورِ انگشتِ حنائی کا
دل اپنا آئنے سے صاف عشقِ پاک رکھتا ہے
پہنا کر شاہدِ عصمت کو جامہ پارسائی کا

حُسنِ پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہُشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا
گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا
وہ شوخ نہاں گنج کے مانند ہے اسمیں
معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اس کا
جو چشم کہ حیراں ہوئی، آئینہ ہے اس کی
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اس کا
وہ یاد ہے اُس کی کہ بُھلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اس کا

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اس کا
آوارگیِ نکہتِ گل ہے یہ اشارہ
جامے سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اس کا
شکرانۂ ساقیِ ازل کرتا ہے آتش
لبریزِ مے شوق سے پیمانہ ہے اس کا

محبّت کا تری بندہ ہر اک کو اے صنم پایا
برابر گردنِ شاہ و گدا دونوں کو خم پایا
برنگِ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں
تو اس نے منزلِ مقصود کو زیرِ قدم پایا
ہزاروں حسرتیں جاویں گی میرے ساتھ دنیا سے
شرار و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا
سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں
غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا
نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں
صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا

جلایا اور مارا حُسن کی نیرنگ سازی نے
کبھی برقِ غضب اس کو کبھی ابرِ کرم پایا
ہر اک جوھر میں اس کا نقش پائے رفتگاں سمجھا
دمِ شمشیرِ قاتل جادۂ راہِ عدم پایا

عاجز نواز دوسرا تجھ سا کوئی نہیں
رنجور کا انیس ہے ہمدم علیل کا
بندہ ہے کس کا پوچھینگے جب منکر و نکیر
عاشق ہوں میں کہوں گا کہ بندہ جمیل کا
دیکھا تو خار و گل کا مقام ایک شاخ ہے
دل توڑتا نہیں تُو عزیز و ذلیل کا
آتش یہی دُعا ہے خدائے کریم سے
محتاج اے کریم! نہ کیجو بخیل کا

ناز و انداز و ادا سے تمھیں شرم آنے لگی
عارضی حسن کا عالم وہ کہاں ہے کہ جو تھا

اثرِ منزل مقصود نہیں دُنیا میں
راہ میں قافلۂ ریگِ رواں ہے کہ جو تھا
پائے خُم سقوں کے ہُو حق کا جو عالم ہو سو ہے
سرِ ممبر وہی واعظ کا بیاں ہے کہ جو تھا

قاتل سنبھل کے تیغ لگا، جائے شرم ہے
تسمہ لگا جو گردنِ بسمل میں رہ گیا
سبقت جو زندگی میں سکندر سے کی تو کیا
اے خضر! پیچھے مرگ کی منزل میں رہ گیا
پار اترا جو کہ غرق ہوا بحرِ عشق میں
وہ داغ ہے جو دامنِ ساحل میں رہ گیا
کافر ہے منکر اُس کی کریمی کی شان کا
خالی پیالہ کب کفِ سائل میں رہ گیا

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا غائبانہ کیا
زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

اڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپ عمر
ہمیز کہتے ہیں گے کسے، تازیانہ کیا

زینہ صبا کا ڈھونڈھتی ہے اپنی مشتِ خاک
بامِ بلند یار کا ہے آستانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے دام و دانہ کیا

طبل و علم نہ پاس ہے اپنے، نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا

ہوتا ہے زرد سُنکے جو نامرد مدعی
رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا

صیاد گلعذار دکھاتا ہے سیرِ باغ
بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا

ترچھی نگہ سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے گا اڑے گا نشانہ کیا

بیتاب ہے کمال ہمارا دلِ حزیں
مہماں، سرائے جسم کا، ہوگا روانہ کیا
یوں، مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تونے کہی عاشقانہ کیا

غم نہیں گو اے فلک اُڑتیہ ہے مجھکو خار کا
آفتاب اک زرد پتّا ہے مرے گلزار کا
خانۂ زنجیر سے مثلِ صدا ڈرتا ہوں اب
یاد آتا ہے کفِ پا میں کھٹکنا خار کا

شہر کو، نالوں نے مجھ مجنوں کے، صحرا کردیا
جوشِ سیلِ اشک نے چشموں کو دریا کردیا

کر ڈاپن آگے مردانِ خدا کے چل نہیں سکتا
کفِ داوٗد میں یکساں ہے عالم موم و آہن کا

باغِ عالم کا ہر اک گُل ہے خدا کی قدرت
باغباں کون ہے اس کا، یہ چمن ہے کس کا

خاک میں اسکو ملاؤں اُسے برباد کروں
جان کس کی ہے مری جان! یہ تن ہی کس کا
کیوں نہ بلیساختہ بندے ہوں دل و جاں سے نثار
قدرت اللہ کی بے ساختہ پن ہے کس کا
آج ہی چھوٹے، جو چھٹتا یہ خرابہ کل ہے
ہم غریبوں کو ہے کیا غم، یہ وطن ہے کس کا
یار کو تم سے محبت نہیں تو اے آتش
خط میں القاب یہ پھر مشفقِ من ہی کس کا

میں جو روتا ہوں مرے زخم جگر ہنستے ہیں
شادی و غم سے کیا ہے مجھے توام پیدا

دوستی نبھتی نہیں ہرگز فرومایہ کے ساتھ
رُوح جنّت کو گئی جسم گلی یاں رہ گیا
سامنے ہوتے ہی مژگاں کے، ہُوا دل کو یقیں
موت سے اب تیر کے پلّے کا میداں رہ گیا
کھینچ کر تلوار قاتل نے کیا مجھ کو نہ قتل
شکر ہے گردن تک آتے آتے احساں رہ گیا

کیا بیاں عالم زوالِ حسنِ خوباں کا کروں
روشنی جاتی رہی سروِ چراغاں رہ گیا
کاروانِ نکہتِ گل کر گیا گلشن سے کوچ
صورتِ نقشِ قدم گلزار حیراں رہ گیا
چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

رتبۂ موسیٰ نمازِ پنجگانہ نے دیا
پانچ وقت اللہ سے موقع رہا تقریر کا
معرکے میں ہاتھ قاتل کی کمر میں ڈال کے
کھینچیے دامن سرِ میداں گریباں گیر کا

نہ کھینچا تھا زلیخا کو دامنِ یوسف
اسی کا پردۂ عصمت دریدہ ہونا تھا

بلبل گلوں سے دیکھ کے تجھکو بگڑ گیا
قمری کا طوق سرو کی گردن میں پڑ گیا

پیچھے ہٹا نہ کوچۂ قاتل سے اپنا پانو
سر سے تڑپ کے چار قدم آگے دھڑ گیا
اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں
اُس بُت کے آستانہ کا پتھر گھِڑ گیا
آتشؔ نہ پوچھ حال تو مجھ دردمند کا
سینہ میں داغ، داغ میں ناسور پڑ گیا

یہ دل لگانے میں مَیں نے مزا اُٹھایا ہے
ملا نہ دوست تو دشمن سے اتّحاد کیا

اگرچہ پاسِ محبّت سے ترکِ شیون تھا
برنگِ شمع خموشی میں حال روشن تھا

تن سے بارِ سرِ آمادہ سودا اُترا
شکر ہے خنجرِ قاتل کا تقاضا اُترا
باغ سے بادِ بہاری کی ہے آمد آمد
طاقِ میخانہ سے ہے ساغر و مینا اُترا

شاخِ گل کو بھی نہ آتش نے چھوا تھا اس پہ
خوں تری آنکھوں میں اے بلبل شیدا اترا

آتشِ مست جو مل جائے تو پوچھوں اس سے
تو نے کیفیت اٹھائی ہے خرابات میں کیا

لحد پر یار آتا ہے مرے شرمندہ کرنے کو
نہ منھ دکھلانے کو جا ہے نہ موقع عذر خواہی کا
غنیمت جان اے جنبش ابروئے قاتل کو
بڑی معراج ہے تلوار سے مرنا سپاہی کا
مُسافر کو عدم سے روکنے والا نہیں کوئی
نہ کھینچا خار نے دامن کبھی دنیا سے راہی کا
فرشتوں سے لحد میں گفتگو یاں کون کرتا ہے
شہادت نامہ پڑھ لیں چار مومن کی گواہی کا
مرکب ہے یہ سر تا پا خطا سے اور نسیاں سے
خیالِ خام ہے انساں کو دعویٰ بے گناہی کا

کون وارفتہ نہیں تیری طرحداری کا
حوصلہ سب کو ہے یوسف کی خریداری کا

دوست دشمن نے کیے قتل کے ساماں کیا کیا
جانِ مشتاق کے پیدا ہوئے خواہاں کیا کیا
آفتیں ڈھاتی ہے وہ نرگسِ فتاں کیا کیا
داغ دیتی ہے مجھے گردشِ دوراں کیا کیا
چشمِ بینا بھی عطا کی، دلِ آگہ بھی دیا
میرے اللہ نے مجھ پر کیے احساں کیا کیا
کوئی مردودِ خلائق نہیں مجھ سا آتش
کیا کہوں کہتے ہیں ہندو و مسلماں کیا کیا

بھولنا بحرِ محبت کے غریقوں کو نہ یار
پار بیڑا یہ ترا آتشِ بیتاب! اترا

خدا حامی ہے اپنے بندۂ عاجز کا مشکل میں
نہ واں کھٹکا ہے کچھ ہم کو نہ کچھ ہم کو یہاں کھٹکا

اپنی زباں کو بلبلِ اندوگیں جلا
یاں برقِ نالہ سے قفسِ آہنیں جلا
لیلیٰ کے زلف سا ہے دھواں کچھ بلند آج
مجنوں کے نالے سے کوئی جنگل کہیں جلا

دکھائی آنکھوں نے سیرِ جہانِ رنگا رنگ
قفس کے چاکوں سے مجھکو چمن نظر آیا

سختیِ ایام ہے میرے لیے سامانِ عیش
خشتِ بالیں کو سمجھتا ہوں میں زانو حور کا
کس کے داغِ دل سے محشر میں ملایا جائے گا
روز اک خورشید کو ملتا ہے خلعت نور کا

شب اُس کے افعیِ گیسو کا جو فسانہ ہوا
ہوا کچھ ایسی بندھی گُل چراغ خانہ ہوا
تونگروں کو مبارک ہو شمعِ کافوری
قدم سے یار کے روشن غریب خانہ ہوا

غرورِ عشق زیادہ غرورِ حسن سے ہے
اُدھر تو آنکھ پھری دم اِدھر روانہ ہوا
بھرا ہے شیشۂ دل کو مےِ محبت سے
خدا کا گھر تھا جہاں واں شراب خانہ ہوا
نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا
ہوائے تند سے پتّا اگر کوئی کھڑکا
سمندِ بادِ بہاری کا تازیانہ ہوا
نہیں ہے مثلِ صدف مجھ سا دوسرا کمبخت
نصیب غیر مرے منھ کا آب و دانہ ہوا
دکھائی چشمِ غزالاں نے حلقۂ زنجیر
ہمیں تو گوشۂ صحرا بھی قید خانہ ہوا

یار کی آنکھ سے تو آنکھ ملائی تو نے
گردشِ چشم بھی اے نرگسِ شہلا دکھلا
آسماں اور زمیں کا ہے تفاوت ہر چند
اے صنم! دور ہی سے چاند سا مکھڑا دکھلا

اے جنوں تجھ سے مری آنکھ جھپکنے کی نہیں
قید خانہ تو دکھایا مجھے صحرا دکھلا
باغباں کونسی صورت مرے جی لگنے کی
ایک تو مجھ کو قدِ یار سا بوٹا دکھلا
ایک مدّت سے ہوں آفت طلب اے گردشِ چرخ
کوئی معشوق مجھے آگ بگولا دکھلا
بندۂ شاہِ نجف آتشِ دل خستہ ہے
یا الہٰی اِسے اب مرشدِ مولا دکھلا

نزع میں یار نے صورت نہ دکھائی مجھ کو
دشمن و دوست کو ہنگامِ سفر دیکھ لیا
لے گئی وحشتِ دل گورِ غریباں کی طرف
ہم نے یارانِ گذشتہ کا بھی گھر دیکھ لیا
بھر گیا دامنِ نظّارہ گُلِ نرگس سے
آنکھ اٹھا کر جو کبھی تو نے اِدھر دیکھ لیا
رُو برو رہنے لگا آئینہ آتش شب و روز
یار کو غیر سے بھی شیر و شکر دیکھ لیا

برقِ خرمن تھا کبھی نالہ دلِ ناشاد کا
حوصلہ باقی نہیں ہے آسماں فریاد کا

اسقدر ایذا ہمیں دی ہے بتوں کے عشق نے
حوصلہ جاتا رہا دل کو خدا کی یاد کا

آشیانہ ہو گیا اپنا قفس فولاد کا
آب و دانہ نے دکھایا گھر ہمیں صیاد کا

حوصلہ کیا عندلیبِ خانماں برباد کا
روئے گل بھولے جو منہ دیکھے مرے صیاد کا

گردشِ چشمِ بتاں سے مل گیا میں خاک میں
آسماں کو شوق باقی رہ گیا بیداد کا

نہیں کچھ امتیازِ اس عشق کو گم نام و نامی کا
یہ لکھوایا ہے خط مولا سے بندہ کی غلامی کا

گلوئے نالہ کو کرتا ہوں وقفِ تیغِ خاموشی
مبادا بارِ خاطر ہو کسی طبعِ گرامی کا

بسر ہو جائیں گی کمل کے سائے میں فقیروں کی
مبارک اہلِ دولت کو ہو نمگیرہ تمامی کا

وحشتِ دل نے کیا ہے وہ بیاباں پیدا
سیکڑوں کوس نہیں صورتِ انساں پیدا

دل کے آئینے میں کر جوہرِ پنہاں پیدا
در و دیوار سے ہو صورتِ جاناں پیدا

خار دامن سے اُلجھتے ہیں، بہار آئی ہے
چاک کرنے کو کیا گل نے گریباں پیدا

نشّۂ مے میں کھلی دشمنی دوست مجھے
آبِ انگور نے کی آتشِ پنہاں پیدا

باغِ سنسان نہ کر ان کو پکڑ کر صیاد
بعد مدّت کے ہوئے مُرغِ خوش الحاں پیدا

اک گُل ایسا نہیں، ہووے نہ خزاں جسکی بہار
کون سے وقت ہوا تھا یہ گلستاں پیدا

موجد اس کی ہے سیہ روزی ہماری آتشؔ
ہم نہ ہوتے تو نہ ہوتی شبِ ہجراں پیدا

کوُے جاناں میں بھی اب اسکا پتا ملتا نہیں
دل مرا گھبرا کے کیا جانے کدھر جاتا رہا

نے کشش معشوق میں پاتا ہوں نے عاشق میں جذب
کیا بلا آئی محبت کا اثر جاتا رہا

واہ رے اندھیر! بہر روشنیٔ شہر مصر
دیدۂ یعقوب سے نورِ نظر جاتا رہا

اک نہ اک مونس کی فرقت کا فلک نے غم دیا
دردِ دل پیدا ہوا، دردِ جگر جاتا رہا

فاتحہ پڑھنے کو آئے قبرِ آتشؔ پر نہ یار
دو ہی دن میں پاسِ الفت اسقدر جاتا رہا

فریبِ حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ، بُت سے برہمن بگڑا

نہیں بے وجہ ہنسنا اس قدر زخمِ شہیداں کا
تری تلوار کا منہ کچھ نہ کچھ اے تیغ زن! بگڑا

کہا بلبل نے جب توڑا گلِ سوسن کو گلچیں نے
الٰہی خیر کیجو، نیلِ رخسارِ چمن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مُو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

جہاں خالی نہیں رہتا کبھی ایذا دہندوں سے
ہُوا ناسورِ نو پیدا، اگر زخمِ کہن بگڑا
لگے منھ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

نہ چھوٹے گا، چھڑا کر اس کو اے قاتل! نہ بن لڑکا
وفاداروں کے خوں کا داغ کیا دھبّا ہے کیچڑ کا
شرابِ لالہ گوں سے ساقیا جامِ صبوحی بھر
شفق اپنی مجھے دِکھلا رہا ہے نورُ کا تڑکا
زوالِ حُسن ہے عاشق کنارہ کرتے جاتے ہیں
بہارِ باغ ہوتی ہے خزاں، موسم ہے پت جھڑ کا
عجب محبوب باشوکت ہے اے بادِ بہاری تُو
صدائے خندۂ گُل ہے سواری کا تری تڑکا
روا رکھ کلفتِ ایام میں بھی قدر نیکوں کی
پھٹے کپڑوں میں بھی ان کو سمجھ لے لعل گودڑ کا
گل و بلبل کی حالت پر بجا ہے گریۂ شبنم
اسے گلچیں کا اندیشہ، اسے صیاد کا دھڑکا

چُھٹے ہیں حلقۂ گیسو جو اس رُخسارِ روشن پر
بغل میں ظلمتِ شب نے لیا ہے نُور کا تڑکا

رفیع القدر ہر مصرع ہے اپنی بیتِ موزوں کا
نہ ایسا طاقِ کسریٰ تھا نہ قصر ایسا فریدوں کا
زباں سے اپنی تعریف اپنی آنکھوں کی وہ کرتے ہیں
لبِ معجز بیاں سے سنتے ہیں افسانہ افسوں کا
زوالِ حسن میں تو لوٹ لینے دیجیے کیفیت
بہار آخر ہے چلتا دور ہے صہبائے گلگوں کا
چمن کی سیر کو خورشید سے پہلے وہ ترک آوے
نسیمِ صبح سے آگے قدم ہو اسکے گلگوں کا

تری زلفوں نے بل کھایا تو ہوتا
ذرا سنبل کو لہرایا تو ہوتا
چلے گا کبک کیا رفتار تیری
یہ اندازِ قدم پایا تو ہوتا
کہے جاتے وہ سُنتے یا نہ سُنتے
زباں تک حالِ دل آیا تو ہوتا

سمجھتا یا نہ اے آتش! سمجھتا
دلِ مضطر کو سمجھایا تو ہوتا

سکۂ داغِ وفا اک دن مرے کام آئیں گے
عشق کے بازار میں ان کا چلن ہو جائے گا
وجد ہو گا ہر شجر کو دیکھ کر اس کی بہار
لالۂ غربت مرا داغِ وطن ہو جائے گا
منزلِ مقصود دکھلا دے گی توفیقِ ازل
دوست دشمن ہوں گے، رہبر راہزن ہو جائیگا

نہ رکھی دولتِ دنیا کی خواہش خاکساری نے
خدا نے کر دیا حاکم مجھے اکسیرِ اعظم کا
ہوائے فصلِ گل بھڑکا رہی ہے آتشِ گل کو
چمن میں کر رہا ہے کار روغن آبِ شبنم کا

مر گئے پر نہ اثر حُبِّ شفا کا دیکھا
دردمندوں نے ترے منہ نہ دوا کا دیکھا

سامنے آئینہ رکھتے تو غش آ جاتا
تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا
جوہر لوح کیے نشۂ مے نے روشن
ٹوٹتے ہم نے طلسم ان کی حیا کا دیکھا

دل سے یہ دم فکر ہے قول اپنی زباں کا
بے خونِ جگر کھائے نہیں لطف بیاں کا
شک ہے کمر یار کے اوپر رگِ جاں کا
کیسی رگِ گل، رشتۂ باریک کہاں کا
تشبیہ نئی دوں ترے گیسوئے رسا کو
اترا ہوا چِلّا کہوں ابرو کی کماں کا
قد سرو ہے رخسار ہیں گل آنکھیں ہیں نرگس
رفتار میں عالم ہے ترے باغِ رواں کا
بے مثل ہے، یکتا ہے، جو تصویر ہے اسکی
کھینچا ہوا کس کا یہ مرقع ہے جہاں کا
پیری میں جوانی کے کہاں چہچہے آتش
اب اپنی غزل خوانی ہے غل برگِ خزاں کا

سر سے خامہ منقبت میں سے یہ تامّل ہو گیا
مدحِ حیدر سے کمیتِ خامہ دُلدُل ہو گیا
زلفِ پیچاں سے پریشاں حالِ سُنبل ہو گیا
گُل ترے آگے چراغِ لالہ و گُل ہو گیا
نورِ شمع و رنگِ گل دیکھا جو روئے یار میں
گاہ پروانہ بنا میں، گاہ بلبل ہو گیا

نازو ادا کو ترک مرے یار نے کیا
غمزہ نیا یہ تُرکِ ستمگار نے کیا
سودائے زلف میں مجھے آیا خیالِ رخ
مشتاق روشنی کا شبِ تار نے کیا
سیماب کی طرح سے شگفتہ ہوا مزاج
اکسیر مجھکو میرے خریدار نے کیا
آنکھوں کو بند کر کے تصوّر میں باغ کے
گلشن قفس کو مُرغِ گرفتار نے کیا
اُلٹا اِدھر نقاب تو پردے پڑے اُدھر
آنکھوں کو بند جلوۂ دیدار نے کیا

ہشیاری رنج دیتی ہے قیدِ فرنگ کا
دیوانگی نشانہ بناتی ہے سنگ کا
مہماں بہارِ باغ ہے دو چار روز کی
چندے ہے دَور دَورِ شرابِ فرنگ کا
معجونِ آب و گل ہی سے رہتے ہیں مست ہم
کس کو دماغ ہے مئے یاقوت رنگ کا
مُرغِ چمن کے نالوں سے ہے یہ صدا بلند
قابل ہے دید کے یہ طلسم آب و رنگ کا
وحدت پسند ہے تو زمانے سے کر گُریز
یک رنگ آشنا نہیں ہوتا دو رنگ کا
ساقی نہ قطع سلسلۂ دورِ جام ہو
مطرب نہ تار ٹوٹے اب آوازِ چنگ کا

مَس کیا عجب طلا اگر اکسیر سے ہوا
کم ہے جو کچھ کہ صاحبِ تاثیر سے ہوا
قابو میں یار عشق کی تاثیر سے ہوا
کیا حسنِ اتفّاق یہ تدبیر سے ہوا

دل تنگ چھُٹ کے زلفِ گرہ گیر سے ہوا
سودا نکل کے خانۂ زنجیر سے ہوا
مردانِ عشق زلف کے پھندے میں پھنس گئے
شیروں کو سلسلہ تری زنجیر سے ہوا
دکھلائی شانِ طالعِ بیدار حسن نے
یوسف عزیز خواب کی تعبیر سے ہوا
دنیا سے بے نیاز قیامت نے کر دیا
اکسیر کا جو کام تھا اکسیر سے ہوا
آئینۂ خیال کو منظور تو رہا
جب سامنا ہوا تری تصویر سے ہوا
وحشت ہوئی تصورِ رخسارِ یار سے
دیوانہ آفتاب کی تسخیر سے ہوا
خمخانۂ حدوث میں مستِ قدیم ہوں
طفلی میں مجھ کو نشۂ مے شیر سے ہوا
پھڑکا کیا مرقعِ عالم کے حسن پر
ہر روز عشق اک نئی تصویر سے ہوا
اے پیرِ عقل پھر نہیں آتش ترا مرید
تقدیر کے خلاف جو تدبیر سے ہوا

بیاباں کو بھی ہنگامِ جنوں میں سبز کر دیکھا
سرِ شوریدہ کو پائے غزالاں پر بھی دھر دیکھا
تجھے موجود پایا یار تجھ کو جلوہ گر دیکھا
ترا دیدار آنکھوں کو جو تھا مدّ نظر دیکھا
تری مستانہ آنکھوں نے نہ گردش کا اثر دیکھا
مے گلرنگ سے سو سو طرح پیمانہ بھر دیکھا
تمھارے روبرو پھیکا رُخِ شمس و قمر دیکھا
وہ نانِ بے نمک پایا یہ شیرِ بے شکر دیکھا
سوادِ گیسوئے مشکیں میں ظلمت شام کی پائی
بیاضِ گردنِ محبوب میں نورِ سحر دیکھا
خریدارِ محبّت آئے بھی بازارِ عالم میں
وہی سودا کیا ہم نے کہ جسمیں دردِ سر دیکھا
نیا غمزہ کیا صیاد نے اپنے اسیروں سے
کیا آزاد اُسے جس مرغ کو بے بال و پر دیکھا
حلاوت سے نہیں اک ذرّہ موجودات کا خالی
گرہ میں قند کو باندھے ہوئے ہر نیشکر دیکھا
خدا کی شان اے بُت! جلوہ گر ہو حسن سی تیرے
تجلّی طوُر پر دیکھی جو تجھکو بام پر دیکھا

خبر اک دن نہ لی پوچھا نہ حال اپنے فقیروں کا
وہ شاہِ حُسن ہم نے بادشاہِ بے خبر دیکھا

یہ مستغرق تصوّر میں ہوئیں اس طاقِ ابرو کی
پھریں اپنی نگاہیں جس طرف کعبہ اُدھر دیکھا

فراقِ یار میں جب عشق نے مجھکو ٹٹولا ہے
جو دل فولاد کا پایا تو پتھر کا جگر دیکھا

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا
شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تری آواز کا

یہ اشارہ ہم سے ہے ان کی نگاہِ ناز کا
دیکھ لو تیر قضا ہوتا ہے اِس انداز کا

رُوح قالب سے جدا کرتا ہے قالب رُوح سے
ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے یہ تیرے ناز کا

سُرمہ ہو جاتا ہے جل کر آتشِ سودا سے یار
دیکھنے والا تری چشمِ فسوں پرداز کا

حیرت آنکھوں کو ہی نظارہ میں اس محبوب کے
یہ نہیں کھلتا کہ دل کشتہ ہے کس انداز کا

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصع ساز کا

رہا بہار و خزاں میں یہ حال سودے کا
بڑھا تو زلف ہوا، گھٹ گیا تو خال ہوا
سُنا جمیل بھی تیرا جو نام اے محبوب
ہزار جان سے دل بندۂ جمال ہوا

وحشت نے ہمیں جب کہ گلستاں سے نکالا
غیرت نے قدم پھر نہ بیاباں سے نکالا
ہاتھوں نے جو مہندی کو گلستاں سے نکالا
سُرمہ کو ان آنکھوں نے صفاہاں سے نکالا
وحشت نے کیا خانۂ زنجیر سے باہر
صحرا کی ہوا نے مجھے زنداں سے نکالا

عیسیِ مریم وہ لعلِ روح پرور ہو گیا
روئے زیبا حسنِ یوسف سے پیمبر ہو گیا

ظلم سے اپنے پشیماں وہ ستمگر ہو گیا
دل ہمارا صبر کرتے کرتے پتھر ہو گیا
اک الف سے قد کے سودے میں ہوا آتش فقیر
چار ابرو کو صفا کر کے قلندر ہو گیا

موسمِ گُل کی ہوا نے دُور کی قیدِ لباس
زائل اعجازِ جنوں سے عقل کا افسوں ہوا
گاہ گریاں، گاہ خنداں، گاہ نالاں، گہہ خموش
عشق کے نیرنگ سے حال اپنا گوناگوں ہوا

آ گیا مجھ کو پسینہ جب کوئی ملزم ہوا
خاک میں میں مل گیا جب سر کسی کا خم ہوا
نغمۂ بلبل کی خاطر کان تو رکھتا ہے گُل
گوشِ صوفی سے سُنا تو وجد کا عالم ہوا
مر گیا سودائے گیسوئے مسلسل میں جو میں
خانۂ زنجیر میں چالیس دن ماتم ہوا
پھر گئے آنکھوں میں مشتاقِ گذشتہ نشہ میں
دورِ جامِ مے میں اکثر ذکرِ خیرِ جم ہوا

باغِ عالم میں نہیں کون ثنا خواں تیرا
ذکر کرتا ہے ہر اک مرغِ خوش الحاں تیرا
کوئی تجھ سا نہیں لاثانی ہے تو اے محبوب
حق تو یہ ہے کہ جو عاشق ہو تو انساں تیرا

ہاتھ قاتل کا مرے خنجر تک آ کر رہ گیا
کہنیوں تک آستینوں کو چڑھا کر رہ گیا
باغ میں مَیں بلبلوں کو جو اُڑا کر رہ گیا
خندہ زن گُل ہو گئے، غنچہ مسکرا کر رہ گیا
ہو یہ چکی تھی میرے نالوں سے قیامت آشکار
خواب سے سر فتنۂ محشر اٹھا کر رہ گیا
کارواں یاروں کا پہنچا منزلِ مقصود میں
مَیں بگولے کی طرح سے خاک اُڑا کر رہ گیا
جب کسی لیلیٰ شمائل کا سُنا کانوں سے ذکر
بیدِ مجنوں کی طرح دل تھرتھرا کر رہ گیا
شمع ساں اظہار کا یارا نہ آتش کو ہوا
سرگذشت اپنی زباں تک اپنی لا کر رہ گیا

روے مژہ اُن آنکھوں نے دل کو دکھا دیا
صیاد نے شکار چھُری سے لڑا دیا
تشبیہہ دی جو چہرۂ قاتل کی خال سے
گولی نے بے تفنگ نشانہ اُڑا دیا
کافر سے بھی نہ ہو جو کیا ناز حُسن سے
عاشق کے دل کو توڑ کے کعبہ کو ڈھا دیا
آتش! خرام یار بھی ہے دولتِ کثیر
اکسیر تھا وہ خاک میں جسکو ملا دیا

شوق اگر کوچۂ قاتل کا جو رہبر ہوتا
گام اوّل میں قدم کعبہ کے اندر ہوتا
جام بھر بھر کے مے ناب سے دیتا جمشید
آئینہ تجھ کو دکھاتا جو سکندر ہوتا
عشق ہو بندگیِ حسن سے کیونکر باہر
دوست اللہ کا کیسا ہی پیمبر ہوتا
باغ بے یار جو جاتا تو پے غارتِ دل
تختۂ لالہ قزلباش کا لشکر ہوتا

بہتر دکھائی دیں کہیں شمس و قمر سے آپ
دیکھیں جو آئینے کو ہماری نظر سے آپ

درباں غریب خاک کرے عرضِ باریاب
کانوں کو بند کرتے ہیں میری خبر سے آپ

اچھا ہوں یا بُرا ہوں تمہارا ہوں جو کہ ہوں
آگاہ ہیں غلام کے عیب و ہنر سے آپ

دن کو تو چین لینے دے اے گردشِ فلک
کافی ہے مجکو گردشِ ساغر تمام رات

راحت کا ہوش ہے کسے آتش! بغیر یار
بالیں ہے خشت، خاک ہے بستر تمام رات

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری
خط دیا لیکن نہ بتلایا نشانِ کوئے دوست

رند ہوں مجھکو خراباتِ مغاں جنت ہے
سرِ زاہد کو مبارک رہے سودائے بہشت

حکم سے اپنے جہنم میں جسے تو بھیجے
پھر وہ کافر ہے جو اسکو رہے پروائے بہشت
داورِ حشر سے محشر میں کہوں گا میں بھی
یہ گنہگار بھی رکھتا ہے تمنائے بہشت
محفلِ حور وشاں کو یہی میری ہے دعا
تجھکو آباد رکھے انجمن آرائے بہشت
عاشقِ ساقیِ کوثر ہوں میں رند اے آتش!
مئے کوثر کے لیے ہے مجھے سودائے بہشت

آئے بہار جائے خزاں ہو چمن درست
بیمار سال بھر کے نظر آئیں تندرست
منصور بھی جو ہوں تو انا الحق کہیں نہ ہم
اپنے طریق میں نہیں یہ ما و من درست
رنگیں خیال میری طرح ہو جو باغباں
ہر ایک فصل میں رہے رنگِ چمن درست
آرائشِ جمال کو مشاطہ چاہیے
بے باغباں کے رہ نہیں سکتا چمن درست

آئینہ سے بنے گا رُخِ یار کا بناؤ
شانہ سے ہوگی زلفِ شکن در شکن دُرست
قاتل کے اشتیاق میں خود کاٹتے گلا
آراستہ ہے گور ہماری، کفن درست
آتش وہی بہار کا عالم ہے باغ میں
تا حال ہے دماغ ہوائے چمن درست

کہہ کے یہ ساقی سے رکھتے ہیں گرو، دستار مست
سر برہنہ ہے جو مستوں میں وہ ہے سردار مست
میکدہ میں نشّہ کی عینک دکھاتی ہے مجھے
آسماں مست و زمیں مست و در و دیوار مست
خار خارِ دل کہے کس سے، سُنے بلبل کی کون
باغباں مست و صبا مست و گُل و گلزار مست

دو ٹکڑے کر چکے کہیں تیغ دو سر کی چوٹ
سر کو جھکا کے کر چکے قاتل کمر کی چوٹ
مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

اے آسماں دکھائیں گے آیا جو بام پر
پیدا کیا ہے ہم نے بھی شمس و قمر کی چوٹ
بدبیں کو اپنی بزم میں اے بُت جگہ نہ دے
پتھر کو کاٹتی ہے یہ کافر نظر کی چوٹ
مفلس کا کام یاں نہیں دولت کا کھیل ہے
دنیا قمار خانہ ہے چلتی ہے زر کی چوٹ
سودائے عشق ہو نہ تمہارے دماغ میں
آتش بٹھا ہی دیتی ہے انساں کو سر کی چوٹ

فصلِ گُل ہے لُوٹیے کیفیتِ میخانہ آج
دولتِ ساقی سے مالا مال ہے پیمانہ آج
بادشاہِ وقت ہے اپنا دلِ دیوانہ آج
داغِ سودا ہم کو دیتا ہے جنوں نذرانہ آج
دولت دنیا سے مستغنی ہوں میں دیوانہ آج
گنجِ گُل دیتا ہے میرے واسطے ویرانہ آج
تیرے کوچے کا ہے اے خانہ خراب! افسانہ آج
شیخ کعبہ چھوڑتا ہے برہمن بُت خانہ آج

خوبرو تجھ سا کوئی بازارِ عالم میں نہیں
قیمتِ یوسف نہ تھی جو ہے ترا بیعانہ آج

مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرفِ شیشہ و پیمانہ آج

دیکھوں تو کیونکر پری ہوتی نہیں شیشے میں بند
بعد مدت ہوش میں آیا ہوں میں دیوانہ آج

نزع کی مشکل بھی آساں ہوتی ہی آتش! نہ ڈر
شاہِ مرداں سے طلب کر ہمتِ مردانہ آج

شفقِ صبح نہ دیکھی نہ سُنی نوبتِ صبح
وقت کو ہاتھ سے کھوتی ہے مری غفلتِ صبح

مَے گلرنگ سے بھر جامِ صبوحی ساقی
ظلمتِ گور میں یاد آئی یہ کیفیتِ صبح

باغِ جہاں میں کیا کہوں کیا حال ہے مرا
سُوکھی ہوئی ہے جیسی درختِ کہن کی شاخ

قاتل اپنا جو کرے گنجِ شہیداں آباد
دہنِ زخم کہیں خانۂ احساں آباد

بعد فرہاد کے پھر کوہ کنی میں نے کی
بعد مجنوں کے کیا میں نے بیاباں آباد

سرو اکڑتے ہیں تو غنچے ہیں شگفتہ ہوتے
یوں ہی رہ جائے الٰہی یہ گلستاں آباد

کوچۂ یار میں ہو روشنی اپنے دم کی
کعبہ و دَیر کریں گبر و مسلماں آباد

جسطرف دیکھیے آتا ہے نظر وہ محبوب
جلوۂ یار سے ہے عالمِ امکاں آباد

ساری رونق ہے یہ دیوانوں کے دم سے آتشؔ
طوق و زنجیر سے ہوتا نہیں زنداں آباد

مے گلرنگ سے لبریز رہیں جام سفید
چشمِ بدبیں کو کرے گردشِ ایام سفید

بس ہے اتنی ہی زمانے کی دورنگی آتشؔ!
مےِ گلرنگ سے لبریز رہیں جام سفید

رنگ و رخسارِ گل و لالہ دگرگوں ہو گا
نہ رہے گی یہ گلستاں کی ہوا میرے بعد
زندگی تک ہیں قیامت کے یہ دھڑکے سارے
مجھکو کیا غم ہے اگر حشر ہوا میرے بعد

عیسیٰ نے نسخے میں ترے بیمار کے لکھا
دردِ فراق کو کرے پروردگار دُور
اے خضرِ راہِ منزلِ مقصودؑ الغیاث
چھُوٹا ہے مجھ غریب کا مجھ سے دیار دُور
پیری میں ترکِ مے کا ارادہ نہ کیجیو
آتش! صبوحی کرتی ہے شب کا خمار دُور

زورِ بازو ہی کو بازو کا مَیں سمجھا تعویذ
بس ہے انسان کو تقدیر کا لکھا تعویذ
دل کے دشمن سے رہی جنگ ہمیشہ درپیش
نہ زرہ پہنی کبھی میں نے نہ باندھا تعویذ
جذبۂ دل سے پری رُویوں کو تسخیر کیا
نہ تو گاڑا، نہ جلایا، نہ بہایا تعویذ

ٹیڑھے سیدھے سے غرض رکھتے نہیں اے آتش!
جو کہے یار ہمیں، سن کے یہ کہنا، بہتر

کعبہ ساں جائے ادب ہے چار دیوار لحد
یاں قدم رکھتا ہے تخت اپنا سُلیماں چھوڑ کر

اے جنوں رکھیو بیاباں کو سواری تیار
آج کل چلنے کو ہے بادِ بہاری تیار

طفلی سے ہوں دوچارِ نشیب و فرازِ دہر
راحت نہ گور میں تھی، نہ آرام دوش پر
نادانی کا سبب ہے جو ہے طفل کو قرار
رہنے نہ دے گی گردشِ ایّام دوش پر

ہم سے خلاف ناحق صیّاد و باغباں ہے
نالوں سے اپنے کس دن بجلی گری چمن پر

زمیں پکڑی تو پھر چھوڑی نہ ہرگز بید مجنوں نے
نشانِ داغ مجنوں رہ گیا صحرا کے دامن پر
ہر اک مصرع میں یاں مضموں ہے آتش! دوستداری کا
ہمارے شعر کا انصاف ہے انصاف دشمن پر

بہار آئی ہے عالم ہے گل و نسرین و سوسن پر
جوانانِ چمن نازاں ہیں اپنے اپنے جوبن پر
ادب آموز ہے ہر ایک ذرّہ اپنے وادی پر
نہیں ممکن کہ گرد اُڑ کر پڑے رہرو کے دامن پر
حرارت طورؔ کے شعلے کی ہر اک دانہ رکھتا ہے
یقیں ہے، خاک ہو بجلی گرے گر اپنے خرمن پر
جو کامل ہیں، نہیں اندیشہ آتش اُن کو بدبیں کا
دہانِ زخمِ کاری خندہ زن ہیں چشمِ سوزن پر

کیا سمجھ کر روندتے ہیں مجھ کو سیّارِ چمن
سبزۂ بیگانہ ہوں لیکن ہوں مہمانِ بہار
رنگ میرا اور تیرا دیکھ کر حیراں ہوئے
نقشبندانِ خزاں و نقش بندانِ بہار

عالم حجابِ یار کا تا حال ہے وہی
خلوت نشیں ہے روشنیِ انجمن ہنوز

فیض سے ابرِ بہاری کے ہوئے گلزار سبز
ساقیِ میخانہ کو بندھوائیے دستار سبز

حالت نزع ہے صورت کوئی بچنے کی نہیں
اُٹھ گیا رو کے جو آیا ترے بیمار کے پاس
باغِ عالم میں جو رکھا ہے قدم اے آتش!
خندہ زن گل کی طرح بیٹھ کے ہو خار کے پاس

گلشنِ عیش کے نظارے کو
مثلِ غنچہ گرہ میں زر ہی شرط
جھوٹے سچوں کا دیتے ہیں دھوکا
جوہری کے لیے نظر ہے شرط

خاک ہو جاتی ہے جل کر ہمرہِ پروانہ شمع
ہے تو زن، رکھتی ہے لیکن غیرتِ پروانہ شمع

شام کو آتی ہے وقتِ صبح کر جاتی ہے کوچ
منزلِ ہستی کو سمجھے ہے مُسافر خانہ شمع،
تیری محفل میں اگر دیکھے مری گستاخیاں
شوخیِ پروانہ سمجھے بازیِ طفلانہ شمع
سوزشِ دل کا بیاں کچھ کچھ کیا تھا رات کو
موم بن کر بہہ گئی سن کر مرا افسانہ شمع
گریۂ مستانہ کرتے کرتے آخر ہو گئی
کر چکی معمور اپنی عمر کا پیمانہ شمع

اللہ ہو وے بُلبلِ ناشاد کی طرف
گلچیں ! جو بولتا ہے تو صیاد کی طرف
چلنے میں کی جو شوقِ شہادت نے رہبری
گردن جھکائی کوچۂ جلاد کی طرف
لایا ہے عشق حسن کا تیرے کشاں کشاں
آتا تھا کون عالمِ ایجاد کی طرف
گردوں سے چاہتے ہیں یہی ہم گناہ گار
منہ سوئے قبلہ، آنکھیں ہوں جلاد کی طرف

جوشِ جنوں ہے موسم گل کا ہی زور شور
سودائی کھینچے جاتے ہیں فصاؔد کی طرف
دھوکا دیا ہے دام نے کس گُل کی زلف کا
بلبل اشارے کرتے ہیں صیاد کی طرف
آتشؔ یہ وہ زمیں ہی کہ جس میں شفیقِ من
سوؔدا ہوا ہے میرؔ سے اُستاد کی طرف

خدا کرے نہ تمھیں میرے حال سی واقف
نہ ہو مزاج مبارک ملال سی واقف
نہیں جو روز و شب و ماہ و سال سی واقف
وہی ہے خوب زمانے کے حال سی واقف
نہ ہوں گی آنکھیں تمہارے جمال سی واقف
جلا کے طور کرے گی جلال سی واقف
فسانہ طورِ تجلیّ کا سُن کے کان کھُلے
نہ تھے کرشمۂ حسن و جمال سے واقف

قفس تک آئے جو لیکر چمن سے نکہتِ گل
یہ فاصلہ ہے نسیمِ بہار کے نزدیک

کروڑ کوس سے میخانہ دُور ہو ہر چند
کرم کرے تو ہے ابرِ بہار کے نزدیک

بہارِ گل میں جو دل کو ہوائے صحرا ہے
ہؤا ہے رُوح کو قالب سے اپنے زنداں تنگ

سُنتا ہے کون نالہ و فریادِ عندلیب
مدہوش ہے چمن میں پیالہ چڑھائے گُل
رفعِ حجابِ یار کیا آہِ سرد نے
کھولے نسیمِ صبح نے بندِ قبائے گُل
اے عندلیب! تجھکو مبارک ترا چمن
کس کے مزاج سے ہی موافق ہوائے گُل

باغباں آنے دے صیّاد کو آزردہ نہ ہو
نظر آئے گی نہ پھر بلبلِ گلزار کی شکل

شام سے صبح تلک دَورِ شراب آخر ہے
روتے ہیں دیکھ کے خنداں دہنِ جام کو ہم

یادرکھنے کی جگہ ہے یہ طلسمِ حیرت
صبح کو دیکھتے ہی بھول گئے شام کو ہم
آنکھ وہ فتنۂ دوراں ! کسے دکھلاتا ہے
شعبدہ جانتے ہیں گردشِ ایّام کو ہم

غیرتِ مہر، رشکِ ماہ ہو تم
خوبصورت ہو بادشاہ ہو تم
کیونکر آنکھیں نہ ہم کو دکھلاؤ
کیسے خوش چشم، خوش نگاہ ہو تم
حُسن میں آپ کے ہے شانِ خدا
عشق بازوں کے سجدہ گاہ ہو تم
کیوں محبّت بڑھائی تھی تم سے
ہم گنہگار، بے گناہ ہو تم

وحشی تھے بُوئے گُل کی طرح سے جہاں میں ہم
نکلے تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم
شیدائے روئے گُل نہ تو شیدائے قدِّ سرو
صیّاد کے شکار ہیں اس بوستاں میں ہم

ہمّت پس از فنا سببِ ذکرِ خیر ہے
مُردوں کا نام سُنتے ہیں ہر داستاں میں ہم

ساقی ہے، یارِ ماہ لقا ہے، شراب ہے
اب بادشاہِ وقت ہیں اپنے مکاں میں ہم

نیرنگِ روزگار سے ایمن ہیں شکلِ سرو
رکھتے ہیں ایک حال بہار و خزاں میں ہم

دنیا و آخرت میں طلب گار ہیں ترے
حاصل تجھے سمجھتے ہیں دونوں جہاں میں ہم

پیدا ہوا ہے اپنے لیے بوریائے فقر
یہ نیستاں ہیں، شیر ہیں اس نیستاں میں ہم

خواہاں کوئی نہیں تو کچھ اس کا عجب نہیں
جنسِ گراں بہا ہیں فلک کی دکاں میں ہم

کیا حال ہے کسی نے نہ پوچھا، ہزار حیف
نالاں رہے جرس کی طرح کارواں میں ہم

آیا ہے یار فاتحہ پڑھنے کو قبر پر
بیدار بخت خفتہ ہے، خوابِ گراں میں ہم

شاگردِ طرزِ خندہ زنی میں ہے گل ترا
اُستادِ عندلیب ہیں شور و فغاں میں ہم

آتشِ سخن کی قدر زمانے سے اُٹھ گئی
مقدور ہو تو قفل لگا لیں دہاں میں ہم

چمن میں رہنے دے کون آشیاں نہیں معلوم
نہال کس کو کرے باغباں، نہیں معلوم
مرے صنم کا کسی کو مکاں نہیں معلوم
خدا کا نام سُنا ہے نشاں نہیں معلوم
اخیر ہو گئے غفلت میں دن جوانی کے
بہارِ عمر ہوئی کب خزاں، نہیں معلوم
بہ اشتیاق، شہادت میں محو تھا دمِ قتل
لگے ہیں زخم بدن پر کہاں، نہیں معلوم
سُنا جو ذکرِ الٰہی تو اس صنم نے کہا
عیاں کو جانتے ہیں ہم نہاں، نہیں معلوم
کیا ہے کس نے طریقِ سلوک سے آگاہ
مُرید کس کا ہے پیرِ مغاں نہیں معلوم
جہان و کارِ جہاں سے ہوں بے خبر میں مست
زمیں کدھر ہے کہاں آسماں نہیں معلوم

سپرد کس کے مرے بعد ہو امانتِ عشق
اُٹھائے کون یہ بارِ گراں، نہیں معلوم

اس قدر آنکھیں مری محو تماشا ہو گئیں
پتلیاں پتھرا کے آخر سنگِ موسیٰ ہو گئیں
باغ کو سرسبز بارانِ بہاری نے کیا
شاعروں کے واسطے تشبیہیں پیدا ہو گئیں
کنجِ عزلت میں قناعت کی جو نانِ خشک پر
نعمتیں دنیا کی جو کچھ تھیں، مہیّا ہو گئیں

حیران کار رہتے ہیں آئینہ کی طرح
آنکھوں سے پوچھیے کہ پڑی ہے نظر کہاں

قیدِ ہستی سے ہنوز آزادگی حاصل کہاں
روح سے چھوٹا ہے یہ زندانِ آب و گِل کہاں
صورتِ ریگِ رواں گرمِ سفر ہوں روز و شب
یہ کچھ نہیں معلوم جاتا ہوں کدھر منزل کہاں

بحرِ ہستی سا کوئی دریائے بے پایاں نہیں
آسمانِ نیلگوں سا سبزۂ ساحل کہاں
کونسا ایسا کیا ہے مجھ سے یاروں نے سلوک
یاد آتی ہے عدم میں جا کے یہ محفل کہاں
خندہ زن دیکھا نہ اک مُردے کو زندہ کی طرح
ہوشیاری کے مزے سے آشنا غافل کہاں

بدن سا شہر نہیں، دل سا بادشاہ نہیں
حواسِ خمسہ سے بہتر کوئی سپاہ نہیں
صدا یہ قبر سے بیدار دل کو آتی ہے
عمل جو نیک ہوں تو ایسی خوابگاہ نہیں
خیال اس میں ہے لازم سیاہ چشموں کا
لباس کعبۂ دل کا مرے سیاہ نہیں

برق کو اس پر عبث گرنے کی ہیں تیاریاں
برگِ گل ہی آشیاں کو اپنے ہیں چنگاریاں
موت کے آتے ہی ہم کو خود بخود نیند آ گئی
کیا اسی کی یاد میں کرتے تھے شب بیداریاں

خندۂ گُل سے صدائے نالہ آتی ہے مجھے
خونِ بُلبُل سے مگر سینچی گئی ہیں کیاریاں
کچھ ہمیں خالی نہیں کرتے ہیں یہ دیرِ خراب
پھر گئے ہیں یاریوں ہی اپنی اپنی باریاں

شرابِ بیخودی ایسی پلادی ساغرِ گل نے
رہے صیّاد سے مرغِ چمن غافل گلستاں میں
بہار آئی ہے دل بہلائیے پیری میں اے آتش!
جوانانِ چمن کی دیکھیے محفل گلستاں میں

پردے یہ غفلتوں کے اگر دل سے دُور ہوں
مائل سُوئے سجود سرِ پُر غرور ہوں
کُشتے جو حُسنِ گرم کے نالاں ہوں زیرِ خاک
سنگِ مزار جلنے لگیں، کوہِ طُور ہوں
عزمِ طوافِ کعبہ ہے اب کچھ غرض نہیں
آتش بتانِ ہند پری ہوں کہ حُور ہوں

دو قدم غربت سے گر سوئے وطن جاتا ہوں میں
پاؤں شل ہو جاتے ہیں، دیوانہ بن جاتا ہوں میں
گور میں خاکی بدن کو چھوڑ کر جاتی ہے رُوح
جھاڑ کر گوشہ میں گردِ پیرہن جاتا ہوں میں
خوش سلوکی کی زمین و آسماں نے میرے ساتھ
آیا تھا بے پیرہن، پہنے کفن جاتا ہوں میں
ہستیٔ فانی سے قصدِ رُوح ہے سوئے عدم
دل کو خوش وقتی ہے، غربت سے وطن جاتا ہوں میں

ہے یہی اللہ سے اپنی مراد، آتش۔ رہیں،
مست کوے یار میں، طاؤس رقصاں باغ میں

آشنا معنی سے صورت آشنا ہوتا نہیں
آئینہ دل کی طرح سے حق نما ہوتا نہیں
دردمند عشق جویاے دوا ہوتا نہیں
تندرستی سے یہ بیمار آشنا ہوتا نہیں

ہوا ہے قحط کیوں عالم میں موسیٰ و تجلّی کا
وہی پتھر نظر آتے ہیں اب تک کوہساروں میں

وہ بزم ہے یہ کہ لاخیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفے میں بازیِ غلام نہیں
حریفِ اہلِ تنک مشربوں کا کام نہیں
خُمِ فلک سے کم اس میکدہ کا جام نہیں
بُتوں کے گیسو و مژگاں سے مجھکو کام نہیں
شکارِ تیر نہیں میں اسیرِ دام نہیں
چمن سے بلبل و قمری کا عشق حیرت ہے
ثبات گُل کو نہیں، سرو کو قیام نہیں
رفیقِ حال بُرے وقت میں نہیں کوئی
شریک جنگ میں شمشیر کا نیام نہیں
بُتوں کے قہر و غضب کا کسے ہے اندیشہ
خدا نہیں یہ، پیمبر نہیں، امام نہیں
بلند و پست سبکدوش کو برابر ہے
نسیمِ بے سر و پا کا کہاں مقام نہیں

بلند ہو نہ زمیں سے مرا مزار آتش!
نشانِ قبر سے منظور مجھ کو نام نہیں

برگشتہ طالعی کا تماشا دکھاؤں میں
گھر کو لگے جو آگ تو پانی بجھاؤں میں
آنکھیں مری کرے جو منور جمالِ یار
گھی کے چراغ طور کے اوپر جلاؤں میں

وہ بادہ کش ہوں میری آوازِ پا کو سن کر
شیشوں نے سر حضورِ ساغر جھکا دیے ہیں

خار مطلوب جو ہووے تو گلستاں مانگوں
بجلی گرنے کو جو جی چاہے تو باراں مانگوں
شمع گل ہووے جو صبحِ شبِ ہجراں مانگوں
اوس پڑنی بھی ہو موقوف جو باراں مانگوں
خاک میں بھی جو ملوں میں تو کسی صحرا میں
تم سے مٹی بھی نہ اے گبر و مسلماں مانگوں

بخیتِ واژوں نے زباں کو یہ اثر بخشا ہے
تلخیِ مرگ مزا دے جو نمکداں مانگوں

پادشاہی سے فقیری کا ہے پایا بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تختِ سلیماں مانگوں

رنج سے عشق کے ہے راحتِ دنیا بدتر
زخم خنداں ہوں اگر میں گلِ خنداں مانگوں

بلتی ہو مانگنے سے باغِ جہاں میں جو مُراد
گُل سے بلبل کے کفن کے لیے داماں مانگوں

چاہتا ہوں جو وفا طینتِ دلبر میں نہیں
ہے وہ مطلوب مجھے جو کہ مقدر میں نہیں

مرے دل کو شوقِ فغاں نہیں مرے لب تک آئی دُعا نہیں
وہ دہن ہوں جسمیں زباں نہیں وہ جرس ہوں جسمیں صدا نہیں

نہ تجھے دماغِ نگاہ ہے نہ کسی کو تابِ جمال ہے
انہیں کسطرح سے دکھاؤں میں وہ جو کہتے ہیں کہ خدا نہیں

کسے نیند آتی ہے اے صنم ترے طاقِ ابرو کی یاد میں
کبھی آشنائے تہہ بغل سرِ مرغِ قبلہ نما نہیں

عجب اس کا کیا نہ سماؤں میں جو خیالِ دشمن و دوست ہے
وہ مقام ہوں کہ گذر نہیں وہ مکان ہوں کہ پتا نہیں

یہ خلاف ہو گیا آسماں، یہ ہوا زمانے کی پھر گئی
کہیں گل کھلے بھی تو بوند سے، کہیں حسن ہے تو وفا نہیں

مرضِ جدائیِ یار نے یہ بگاڑ دی ہے ہماری خو
کہ موافق اپنے مزاج کے نظر آتی کوئی دوا نہیں

تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویر خیالی رو برو برسوں

برابر جان کے رکھا ہے اس کو مرتے مرتے تک
ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسوں

ملی ہے ہم کو بھی خمخانۂ افلاک میں راحت
سرھانے ہاتھ رکھ کر سوئے ہیں زیرِ سبو برسوں

دیا ہے حکم تب پیرِ مغاں نے سجدۂ خم کا
کیا ہے جب شرابِ ناب سے ہم نے وضو برسوں

بہارِ گل گئے پر بھی نہ سودا جائے گا اپنا
ہمارا پیرہن پھٹ کر ہو دیگا رفو برسوں

صورتِ خواب فراموش ہے یاں عشقِ صنم
اپنے اللہ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں
شہر مسکن کبھی اپنا، کبھی جنگل ماوا
سیرِ ویرانہ و آباد کیا کرتے ہیں
ایک سا ظاہر و باطن نہیں معشوقوں کا
پردۂ ناز میں بیداد کیا کرتے ہیں
لالہ و گل کا نشاں رکھتی نہیں گلچینی
باغباں باغ کو برباد کیا کرتے ہیں
کیا کہوں یار سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے
حضرتِ دل جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں
ذکرِ عاشق سے نہیں ایک دم فرصت ان کو
ناز و انداز وہ ایجاد کیا کرتے ہیں

اُلجھا ہے دل بتوں کے گیسوئے پرشکن میں
اُگتی ہے جائے سبزہ کنگھی مرے چمن میں
شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

ذکرِ فقیر آ گئے اُس بت کے بھولتا ہے
اب کی گرہ میں دوں گا زنّارِ برہمن میں
آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں، گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیّاد کو چمن میں
اک تختہ ہفت کشور دلّی کا ہے ہماری
نو آسماں ہیں اپنے اکبر کے نو رتن میں
دو روز ہے یہ عیش و نشاطِ دنیا
بوئے شبِ عروسی مہماں ہے پیرہن میں
قاتل کا میرے منکر میداں میں آ کے سن لے
آوازِ الاماں ہے اب تک بلند رَن میں
میداں کیا گرا کر اشکوں نے گھر ہمارا
دکھلائی سیرِ غربت سیلاب نے وطن میں
بازارِ مصر میں چل، یوسف کا سامنا کر
کھوٹے کھرے کا پردہ کھُل جائے گا چلن میں
دنیا کی زیب و زینت کفّار کو مبارک
ہندو نے مُردے لپٹیں کمخواب و گلبدن میں
صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی
سا کھو جلا ہے کیا کیا پھولا جو ڈھاک بن میں

قاتل سے اپنے مرتبۂ عشق ہے مجھے
میرے لہو کے داغ نہ داماں سے دُور ہوں

پاتا ہوں اس قدر دلِ عالم سیاہ میں
شمع و چراغِ گورِ غریباں سے دُور ہوں

رُوباہ بازیوں سے فلک کے قریب ہے
شیروں کے نام دفترِ سلطاں سے دُور ہوں

دل کی کدورتیں اگر انساں سے دُور ہوں
سارے نفاق گبر و مسلماں سے دُور ہوں

نزدیک آ چکی ہے سواری بہار کی
برگِ خزاں رسیدہ گلستاں سے دُور ہوں

تجھ سا کوئی زمانے میں معجز بیاں نہیں
آگے ترے مسیح کے منہ میں زباں نہیں

اُس غیرتِ پری کا فسانہ کہاں نہیں
وہ بزم کون سی ہے کہ یہ داستاں نہیں

معلوم کچھ نہیں کہ چلے جاتے ہیں کہاں
ریگِ رواں سے کم مری عمرِ رواں نہیں

رنگیں رہے گا خونِ شہیداں سے کوئے دوست
فردوس کی بہار کو بیمِ خزاں نہیں
اے دل نہ بیقرار ہو، موقوف وقت ہے
مفلس نہیں میں قیمتِ یوسف گراں نہیں

نہ تو دشمن کوئی میرا نہ کوئی میرا دوست
بارِ خاطر نہ کسی کا نہ غبارِ دامن
موسمِ گل کی ہوا چلتے ہی پاؤں کو مرے
خار کی طرح کھٹک جاتے ہیں تارِ دامن

گو عاشقوں میں نام سرِ فرد ہے رقم
بھولا ہے مجھکو صاحبِ دفتر حساب میں
کس کس کے دل میں نقش ہوا روئے یار کا
کیا کیا نگیں کھدے شرفِ آفتاب میں
جانِ عزیز کرتے ہیں تم پر نثار ہم
دل کس شمار میں ہے جگر کس حساب میں
آنکھوں کو گور میں بھی رہے گا خیالِ یار
مشتاق ہوں زیارتِ یوسف کا خواب میں

اے شہسوار! گورِ غریباں میں آ نکل
اپنی بھی مشتِ خاک ہے تیری رکاب میں
آتش! صنم بھی کرنے لگے بے نیازیاں
ہے لاکھ لاکھ شکر خدا کی جناب میں

خدا بخشے صنم یہ کہہ کے مجھ کو یاد کرتے ہیں
دعائے مغفرت میرے لیے جلاد کرتے ہیں
بلائے جاں ہیں پتلے خاک کے بیداد کرتے ہیں
پری کو بند شیشے میں یہ آدم زاد کرتے ہیں
خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ، آئنہ کو یاد کرتے ہیں
یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصور پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے، نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں
بتوں کے عشق نے آخر دکھایا دل کو اُنکے بھی
برہمن پردۂ ناقوس میں فریاد کرتے ہیں
نبردِ عشق میں اللہ حامی ہے غریبوں کا
پیادوں کی سوارِ غیب یاں امداد کرتے ہیں

کوئی ذرہ نوا اس کا پا بداماں اُڑ کے پہنچے گا
یہ مشتِ خاک تیری راہ میں برباد کرتے ہیں

ممکن نہیں ہے دوسرا تجھ سا ہزار میں
ہوتا ہے اک بہشت کا دانہ انار میں
بلبل نہ ہاتھ آئے الٰہی شکار میں
صیاؔد باغ باغ نہ ہووے بہار میں
اے ترکِ مست بہر خدا صید گاہ چل
آہو کباب ہوتے ہیں شوقِ شکار میں
صحرائے تن کی سیر تو مجنوں ذرا کرے
محمل سوار ہے اسی گرد و غبار میں
جامِ شراب عشق سے دونوں ہیں بے خبر
بلبل چمن میں مست ہے، ہم کوے یار میں
برباد ہو رہے ہو کچھ آتش کسے تمئیں نہیں
مٹی خراب اپنی بھی ہے اس دیار میں

صدمے پہنچے ہیں ہمارے بازوؤں پر سینہ کردل
گم ہوئے ہیں اپنے یوسف سے برادر سینہ کردل

فکرِ سنجیدہ نے دکھلائے ہیں کیا کیا آب و رنگ
اِس ترازو میں تُلے ہیں لعل و گوہر سینکڑوں

ہند سے دُور جو کعبہ کو سُنا ہے میں نے
پھیر کھا کھا کے ترے کوچے کو جاتا ہوں میں
نعمتِ عشق بھی ممکن نہیں بے فضلِ خدا
شکر کرتا ہوں اگر داغ بھی کھاتا ہوں میں
ساقیا جام کو اللہ سلامت رکھے،
یہ قدح میرا ہے خیر اسکی مناتا ہوں میں
بے نقاب آتا ہے گلگشت کو وہ رشکِ بہار
بلبلوں کو یہ چمنستاں کی اڑاتا ہوں میں
ساقیِ میکدہ نے مجھ کو یہ خدمت دی ہے
نشہ میں مست جو گرتا ہے اٹھاتا ہوں میں

اختیاری حرکتِ جان نہ مجبوروں کی
لیے جاتی ہے جدھر ہمکو قضا جاتے ہیں
واہ ری بے بصری، واہ ری نابینائی
صورتِ آباد سے مشتاقِ لقا جاتے ہیں

صبح نزدیک ہے، بیدار رہو، دل اے غافل
زہرہ و مشتری و ماہ و سما جاتے ہیں
رنج یاں جنکو ہے آتش! انھیں واں راحت ہے
اے خوشا حال، جو دنیا سے خفا جاتے ہیں

تیرا نیاز مند جو اے نازنیں نہیں
دونوں جہاں میں اسکا ٹھکانا کہیں نہیں
تیغ برہنہ کب نہیں قاتل کے ہاتھ میں
کس وقت کہنیوں سے چڑھی آستیں نہیں
عمرِ گذشتہ کا کہیں لگتا نہیں پتا
بالائے آسماں نہیں، زیرِ زمیں نہیں
کوئی مرے، کوئی جیے، مطلق نہیں خیال
تم سا بھی بے نیاز کوئی نازنیں نہیں

دل نہ جہاں میں کسی چیز کا خواہاں ہوا
سیر ہی کو ہم مگر آئے تھے بازار میں
قیمتِ مالِ خرید بیچتے ہیں جنسِ دل
پہ کچھ بھی ترا انصاف نہ ہو چشمِ خریدار میں

کشورِ دل میں مرے یار ہے فرمانروا
سِکّۂ یوسف چلے مصر کے بازار میں
سروِ سبکبار میں پیچشِ سنبل کہاں
فرق ہے آزاد میں اور گرفتار میں
کافر و دیندار ہیں فہم سے اپنے اختلاف
رشتہ وہی ایک ہے سبحہ و زنّار میں

گیسوؤں کا ترے سودا شعرا رکھتے ہیں
یہی باعث ہے جو یہ فکرِ رسا رکھتے ہیں
تابِ دیدار نہیں رکھتے ہیں یار رکھتے ہیں
چشمِ بینا ترے مشتاقِ لقا رکھتے ہیں
تیرے خونی کفنوں کی یہ ادا رکھتے ہیں
پھول لالے کے لباسِ شہدا رکھتے ہیں
سچ تو یہ ہے کہ نہیں دوسرا تجھ سا کوئی
اے صنم! جھوٹ نہ بولیں گے خدا رکھتے ہیں
کونسے پارۂ دل پر نہیں اک عشق کا داغ
یہ نگیں وہ ہیں کہ جو نقشِ وفا رکھتے ہیں

قلزمِ عشق میں تنکے کا سہارا بھی نہ ڈھونڈھ
آسرا وہ نہیں لیتے جو خدا رکھتے ہیں

پاؤں کو منزلِ مقصود میں مضطر سمجھے
طاقت اُٹھنے کی اگر دستِ دُعا رکھتے ہیں

محتسب! عقل جو رکھتا ہے تو خمخانے نہ جا
شیشہ و جامِ مے ہوش رُبا رکھتے ہیں

بحرِ اُلفت میں تباہی کا ہے اندیشہ کسے
ناخدا جو نہیں رکھتے وہ خدا رکھتے ہیں

جسمِ خاکی کے تلے جسمِ مثالی بھی ہے
اک قبا اور بھی ہم زیرِ قبا رکھتے ہیں

خانہ خراب نالوں کی جل بے شرارتیں
بہتی ہیں پانی ہو ہو کے سنگیں عمارتیں

سر کون سا ہے جس میں کہ سودا نہیں ترا
ہوتی ہیں تیرے نقشِ قدم کی زیارتیں

خانہ ہے گنجفے کا ہر اک قصرِ شہرِ عشق
گھر گھر ہیں بادشاہیاں، گھر گھر وزارتیں

دیدارِ یار برقِ تجلّی سے کم نہیں،
بند آنکھیں ہوں گی دینگی دعائیں بصارتیں

افسانہ گوئی افعیِ گیسوئے یار میں
خاموش ہوں چراغ جو ہم گفتگو کریں
دیدارِ عام کیجیے، پردہ اُٹھائیے
تا چند بندہ ہائے خدا آرزو کریں
مستی میں مجھ سے بے ادبی ہوگی یار سے
مجھکو گنہگار نہ جام و سبو کریں
آتش! یہ وہ زمیں ہے کہ جسمیں ہر قولِ رد
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

آتی ہے کوہِ سوختۂ طور سے صدا
نظّارۂ جمال غضب ہے جلال میں
دَورِ شراب حلقۂ بیرونِ در ہے یاں
اِس بزم میں ہے مست ہر اک اپنے حال میں
آتی ہو باغ سے تو صبا سے ہوں پوچھتا
کتنے شگوفے آئے ہیں کس کس نہال میں

پُرزے بہار میں ہو گریباں تو شکر کر
ہوتی ہے خیر جان کی نقصانِ مال میں
پوچھیں جو کچھ کہ پوچھنا ہو منکر و نکیر
عاجز نہیں ہوں میں بھی سوال و جواب
بھولیں گے عیش میں بھی نہ آتشؔ! غم و الم
یاد آئیں گے فراق کے صدمے وصال میں

مردِ فقیر حق حق کرتے ہیں بوریے پر
شیر اپنے نیستاں میں آتشؔ ڈکارتے ہیں

خمِ فلک سے بھروں وہ شراب شیشے میں
یقین ہو ذروں کو ہے آفتاب شیشے میں
زوال نوش ہوں میں مست، دور میں میرے
رہے گی درد کی مٹی خراب شیشے میں
ہر ایک مست کی، ہو حق ہے نالۂ بلبل
شراب شیشے میں ہے یا گلاب شیشے میں

شرف بخشا گہر کو صرف کر کے تُو نے زیور میں
نگیں کو نام نے تیرے بٹھایا خانۂ زر میں

یہ کیفیت اُسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں
مے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں

تکلف برطرف اے نازنیں موقوف آرائش
نزاکت سے کیوں دیا ہے کیوں پھولوں کے زیور میں

قیامت تک نہیں گردش رہیگی روز و شب انکو
مہ و خورشید حسنِ یار سے آئے ہیں چکر میں

نکل کر کنجِ عزلت سے نہ کر ہنگامہ افروزی
شرر یاقوت کا ہم سنگ ہے جب تک ہے پتھر میں

شرف اللہ نے بخشا ہے آدم پر محمدؐ کو
فضیلت ہے مقدّم سے زیادہ یاں موخّر میں

جہاں چاہے بسر اوقات کر لے چار دن بلبل
چمن میں آشیانہ ہے قفس صیاد کے گھر میں

نہ جب تک ہم پیالہ ہو کوئی میں مے نہیں پیتا
نہیں مہماں تو فاقہ ہے خلیل اللہ کے گھر میں

دھیان اُس کاکلِ مشکیں کا جو آیا مجھکو
خواب میں آکے سیاہی۔ نے دَبایا مجھکو
نہ سُنا تھا سو وہ کانوں نے سُنایا مجھکو
جو نہ دیکھا تھا ان آنکھوں نے دکھایا مجھکو
وا شُدِ دل کے لیے باغ میں آ نکلا تھا
یارِ بن غنچوں نے ہنس ہنس کے رُلایا مجھکو

حُسنِ یوسف کو ترے حُسن سے نسبت کیا ہے
پھونک دے گرمیِ بازار خریداروں کو
عیدِ قرباں ہے ہزاروں ہی گلے کٹتے ہیں
تُو بھی آزاد کر اب اپنے گرفتاروں کو
اے اجل! جسم سے چھُٹ بھی چکے جانِ شیریں
زندگی تلخ ہوئی ہے مرے غمخواروں کو

چشمِ بیمار کا یارب کوئی بیمار نہ ہو
زلف کے پھندے میں دشمن بھی گرفتار نہ ہو
حُسن تکلیفِ لبِ بام اُسے کرتا ہے
شرم سمجھاتی ہے سایہ پسِ دیوار نہ ہو

غیر سے یار سوا تشنۂ خوں ہے میرا
دشمن و دوست کی آنکھوں میں کوئی خار نہ ہو
متّصل نالوں کی آواز چلی آتی ہے
جسمِ حنا کی قفس مرغِ گرفتار نہ ہو
کر دیا ہے یہ حوادث نے دلِ عالم سرد
آتشِ حسن سے گرمیِ بازار نہ ہو
نام سنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا
دل دھڑکتا ہے جدائی کی شبِ تار نہ ہو
گور میں ساتھ لیے جائیں گے اپنے ہم اسے
نہیں ہوتا جو کوئی دل کا خریدار نہ ہو
ترکِ الفت کا ارادہ نہ کر آتش! زنہار
دل سے بیزار تو ہے جان سے بیزار نہ ہو

سروِ بستاں تجھ سے گو اے بادِ صرصر خشک ہو
غیر ممکن ہے ہمارا مصرعِ تر خشک ہو
خوں ہوا جاتا ہے دل، کیا دیدۂ تر خشک ہو
روز ٹانکے ٹوٹتے ہیں زخم کیونکر خشک ہو

ٹھنڈی سانسوں میں اثر ہی پایاں ہوائے برف کا
سرد ہوں آتشکدے خون سمندر خشک ہو
بھیک سے بدتر دعا بھی مانگنا انساں کو ہے
ہاتھ آئے بے طلب نان جویں گر خشک ہو
تند خو پہنچا سکیں عالی دماغوں کو نہ رنج
ارغواں زار شفق صرصر سے کیونکر خشک ہو
داخل فردوس ہو آتش نفس مجھ سا اگر
گلشن جنت خزاں ہو، حوض کوثر خشک ہو
کس توقع پر بھلا اس میکدے میں ہم رہیں
لب نہ تر ہوویں اگر سارا سمندر خشک ہو
غیر خالق کون کرتا ہے کسی کی پرورش
دایہ پیدا ہو جو آتش شیر مادر خشک ہو

ترے سوا کوئی ترکیب دل پسند نہ ہو
جو برق طور بھی چمکے تو آنکھ بند نہ ہو
نکلتی ہی نہیں آئینہ خانہ سے باہر
غرور حسن سے اتنا بھی خود پسند نہ ہو

غرور کھوتی ہے تعلیم خاکساروں کی
اُگے جو سَرو، مری خاک سے بلند نہ ہو
جو روئے حال پر اپنے وہ کیا کسی پہ ہنسے
وہ دل دُکھلائے کسی کا جو دردمند نہ ہو

دیکھیے دونوں میں کس کا ہو بخیر انجام کار
بُت کو سجدہ برہمن کرتے ہیں، ہم اللہ کو

صورت کوئی صفائی کی اب اے صنم! نہیں
جب تک ہمارے تیرے خدا درمیاں نہ ہو
اے آسماں! نمود نہیں ہم کو چاہیے
بعدِ فنا مزار کا اپنے نشاں نہ ہو
بلبل ہزار ذبح ہوں، ٹوٹے نہ ایک گُل
صیاد ہو چمن میں مگر باغباں نہ ہو
گلزارِ لطف و خلق شگفتہ رہے مدام
اِس باغ کی بہار الٰہی خزاں نہ ہو
نالوں کی بحث کا کسے آتش! دماغ ہے
یا ہم نہ ہوویں یا جرسِ کارواں نہ ہو

موسمِ گل ہمیں آتا ہے اجل آتی ہے
گور سے تنگ ہوا جاتا ہے زنداں مجھکو

ہے غرورِ حسنِ دو روزہ سے از خود رفتہ یار
اس قدر بھی نشۂ معجونِ آب و رنگ نہ ہو

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو
مشتاق جو ہوتا ہوں کعبے کی زیارت کا
آنکھیں پھری جاتی ہیں طوفِ حرمِ دل کو
توڑے دلِ عاشق کو وہ بت تو عجب کیا ہے
کافر ہے سمجھتا ہے کیا کعبے کی منزل کو
نظارۂ صورت سے معنی کا خیال آیا
لیلیٰ کے ہوئے مجنوں ہم دیکھ کے محمل کو
رخ سے جو نقاب اپنے وہ آئنہ رو الٹے
حیران ہو، بیخود ہو، سکتہ سا ہو محفل کو
کشتہ نہ ہو دل کیونکر اللہ نے بھیجا ہے
شمشیر سے دو ابرو دیکر مرے قاتل کو

تاخیر نہ کر کوئے محبوب کے چلنے میں
کھوٹی نہیں کرتے ہیں فردوس کی منزل کو
جو چاہیے سو مانگ آتشؔ! درگاہِ الٰہی سے
محروم کبھی پھرتے دیکھا نہیں سائل کو

کھائے گا خنجرِ جلّاد کا بہ جرِ چا پہلو
زخمِ پہلو کو مبارک ہو جگر کا پہلو
دُور سے کوچۂ دلبر کو کھڑا تکتا ہوں
نہ تو دیوار کا تکیہ نہ تو در کا پہلو

خزاں سے پیشتر کارِ گُل و بُلبل کیا آخر
جزائے خیر دے اللہ صیّاد اور گلچیں کو
ہزار افسوس ہے اے بے مروّت! تو نہیں آتا
غش آجاتا ہے اکثر تیرے بیتابوں کی تسکیں کو
تماشا دیکھتا ہوں گھر میں بیٹھے ہفت کشور کا
بنایا ہے مرا دل توڑ کر جامِ جہاں بیں کو
نئے ہر سال سیرِ کارِ جنوں سے داغ ملتے ہیں
بہارِ گل کیا کرتی ہے جاری تازہ آئیں کو

نہ گھبرا اس قدر شامِ شبِ فرقت! سحر ہوگی
دعا تو مانگ غافل مستعد اختر ہے آمیں کو

پری سے چہرے پر لہرا کے سو سو بار آتی ہے
ہوا ہے آج کل سودا تمہاری زلفِ مشکیں کو

ہمارا کاسۂ سر راہ افتادہ ہے مدت سے
خدا توفیق دے ٹھوکر کی ان پائے نگاریں کو

خرامِ ناز کی مشق آج کل ان کو نہایت ہے
رہا کرتا ہے گھڑیوں زلزلہ سا کوہِ تمکیں کو

سنی ہیں کافرانِ عشق کے منہ سے جو تعریفیں
مسلماں ڈھونڈتے پھرتے ہیں اس غارتگرِ دیں کو

نظر پڑ جائے جو تیرے صفائے رخ کا آئینہ
نظر بدبیں کی پھر کر کور کر دے چشمِ بدبیں کو

فراقِ یار میں جب سامنے آیا تو آنکھوں نے
نگاہِ زہر آلودہ سے دیکھا خوابِ شیریں کو

تمنا دولتِ دنیا کی اے آتش! انہیں رہتی
قناعت سے غنی اللہ کر دیتا ہے مسکیں کو

دلِ بے تاب کو فریاد و فغاں کرنے دو
پہلوئے غمّاز ہی کو قصّہ بیاں کرنے دو
جانبِ دشتِ عدم خیمہ رواں کرنے دو
وحشتِ دل کو علاجِ خفقاں کرنے دو
کوہِ غم ٹوٹنے پر آہ ہے بھاں کم ظرفی
ٹھیس سے کاسۂ چینی کو فغاں کرنے دو
آخرِ کار تہہ خاک ہے مسکن سب کا
اہلِ دولت کو بلند آج مکاں کرنے دو
انتظارِ ملک الموت میں بیدار ہوں میں
بخت خفتہ کو مرے خوابِ گراں کرنے دو
پھوٹ بہنے دو انہیں یار کے آگے آتش!
دل کا احوال بھی آنکھوں کو بیاں کرنے دو

جور و جفائے یار سے رنج و محن نہ ہو
دل پر ہجوم غم ہو، جبیں پر شکن نہ ہو
شادی نہیں قبول مجھے، غم قبول ہے
میری خوشی سے تنگ مرا پیراہن نہ ہو

رو اس قدر کہ آبروِ ابر تر رہے
اتنا نہ ہنس کہ برق کبھی خندہ زن نہ ہو
وہ کم نصیب ہوں کہ میسر کبھی جسے
معشوقِ نوجوان و شرابِ کہن نہ ہو
ہستی میں یاد آئے نہ کیونکر عدم مجھے
وہ آدمی نہیں جسے حُبّ الوطن نہ ہو

چار ہی دن میں نہ رکھا بلبل و گل کا نشاں
کھا گئی صیّاد و گلچیں کی نظر گلزار کو
سرکشی نے پائی آتش! خاکساری سے شکست
فضل سے اللہ کے توڑا بُتِ پندار کو

دوست رکھتے ہیں جواں مرد اہلِ جوہر یار کو
تول کو زر سے سپاہی لیتے ہیں تلوار کو
کردیا نورِ دگر سرمہ نے چشمِ یار کو
نرگسِ شہلا بنایا نرگسِ بیمار کو

چہرۂ رنگیں کی دکھلائی تصوّر نے بہار
بند آنکھوں کو کیا کھولا درِ گلزار کو
وقتِ آخر عشقِ پنہاں یار پر ظاہر ہوا
نزع میں عیسیٰ نے پہچانا مرے آزار کو

جو نعمت عشق کی چاہے تو راحت جان ایذا کو
عصا پیچھے دیا پہلے جلا یا دستِ موسیٰ کو
خدا جانے کہ ہو گا حال کیا ہم بادہ نوشوں کا
لڑا کر جام سے توڑا ہے بدمستی میں مینا کو
شب و روز اسکو رقصِ شادمانی میں میں پاتا ہوں
حصارِ عافیت گرداب نے سمجھا ہے دریا کو
دلِ پژمردہ ہوتا ہے شگفتہ کوئے جاناں میں
ہوائے باغِ جنّت زندہ کر دیتی ہے موتا کو
مری میراث ہے خلدِ بریں فرزندِ آدم ہوں
سرہانے جانتا ہوں اپنے میں زانوئے حوّا کو
تراشا تجھکو جس بُت ساز نے اے بُت اِ قیامت کی
بنایا شیشہ سے نازک مزاجِ سنگِ خارا کو

یدِ بیضا سا روشن یار کا رخسار ہے آتش!
لبِ جاں بخش رکھتے ہیں دمِ پاکِ مسیحا کو

یارب! آغازِ محبت کا بخیر انجام ہو
شیشہ میں اترے پری پختہ جنونِ خام ہو

ابرِ دریا بار آ پہنچا قریبِ میکدہ
ناخدائے کشتیٔ مے ساقیٔ گلفام ہو

راز ہے سن لو اسے تم سے کہے رکھتے ہیں ہم
انجمن میں بات خلوت کی نہ آتش! عام ہو

محبت سے بنا لیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو
جھکاتی ہے ہماری عاجزی سرکش کی گردن کو

حقیقت ہم سے پوچھے کوئی اِس عشقِ مجازی کی
بہت دیکھا ہے تصویرِ گلی کے رنگ و روغن کو

یہ قصرِ یار کو پیغام دینا اے صبا میرا
نگاہیں ڈھونڈتی ہیں تیری دیواروں کی روزن کو

رُسوا نہ نالے کرکے، دلِ بیقرار! ہو
بدتر ہے عشق عیب سے جب آشکار ہو
مستِ شرابِ عشق کب آتے ہیں ہوش میں
یہ نشہ وہ نہیں ہے کہ جس کو خمار ہو

جلا دیتی ہے اپنی گرم رفتاری بیاباں کو؛
کھٹکتے ہیں ہمارے آبلے خارِ مغیلاں کو
نہیں تیرے کرم کو قید کچھ اعلیٰ و ادنیٰ کی
سکندر تشنہ رہ جائے، پیے خضر آبِ حیواں کو

فقیری سلطنت ہے خاکسارِ کوئے جاناں کو
مبارک جام ہو جمشید کو خاتم سلیماں کو
محبت کی نگہ سے لطف ہر اک رنگ میں پایا
تماشا تھا جو دیکھا چشمِ بلبل سے گلستاں کو

دو روزہ نوجوانی ہے، دو روزہ تاجداری ہے
مروّت حسن کو، اللہ دے انصاف سلطاں کو

نکلتی کس طرح ہے جان مضطر دیکھتے جاؤ
ہمارے پاس سے جاؤ تو پھر کر دیکھتے جاؤ
نسیم نو بہاری کی طرح آئے ہو گلشن میں
تماشائے گل و سرو و صنوبر دیکھتے جاؤ
جدھر جاتے ہو ہر گھر میں سے یہ آواز آتی ہے
مسیحا ہو جو بیماروں کو دم بھر دیکھتے جاؤ
قدم انداز سے باہر ہوئے جاتے ہیں صاحب کے
ستم رفتار میں کرتی ہے ٹھوکر دیکھتے جاؤ
روش مستانہ چلتے ہو قدم مستانہ پڑتے ہیں
خدا کے واسطے بہر پیمبر دیکھتے جاؤ
نقاب اک دن الٹ کر تم نے یہ منہ سے نہ فرمایا
جمال آفتاب ذرہ پرور دیکھتے جاؤ
نہ پھیرو اس سے منہ آتش! جو کچھ در پیش آجائے
دکھاتا ہے جو آنکھوں کو مقدر دیکھتے جاؤ

ہے نرالی کشش عشق جفا کار کی راہ
چاہِ کنعاں میں ملی مصر کے بازار کی راہ

رہنما یادِ الٰہی کا ہوا عشقِ صنم
پہنچے ہم کعبۂ مقصود کو کہسار کی راہ

شہرۂ حُسن نے دیدار کا مشتاق کیا
نکہتِ گُل نے بتائی مجھے گلزار کی راہ

بیشتر سب سے کیا طالعِ بد نے بیدار
حشر کے روز بھی دکھلائی مجھے یار کی راہ

تنگ دستی نے زمانے میں یہ پایا ہے رواج
یوسف اس عہد میں تکتا ہے خریدار کی راہ

حسن کے عشق نے ہستی میں عدم سے کھینچا
شوقِ یوسف نے دکھائی ہمیں بازار کی راہ

عید ہوگی، رمضاں جائے گا اے بادہ کشو
بند رہنے کی نہیں خانۂ خمار کی راہ

غیرِ حق کو میں سمجھتا ہوں خیالِ باطل
آتش! اک دل میں نہیں ہوتی ہے دو چار کی راہ

کہتا ہے وہ شوخ آئنہ میں عکس سے آتش!
تم ہم سے زیادہ ہو تو ہم تم سے زیادہ

دوں گا سزا میں تارِ گریباں سے باندھ کر
رازِ جنوں کریں گے اگر آشکار ہاتھ
دیوانے منتظر ہیں نسیمِ بہار کے
کپڑوں کے پھاڑنے کے ہیں اُمیدوار ہاتھ
رخسارۂ صنم سے اُلٹ کر نقاب کو
دکھلا رہی ہے قدرتِ پروردگار ہاتھ

خدا یاد آگیا مجھ کو بُتوں کی بے نیازی سے
ملا بامِ حقیقت زینۂ عشقِ مجازی سے
بُھلایا اِسمِ اعظم کو فسونِ حسنِ اُولیٰ نے
فرشتوں کی حقیقت کُھل گئی عشقِ مجازی سے

دل کہیں، جان کہیں، چشم کہیں، گوش کہیں
اپنے مجموعے کا ہر ایک ورق برہم ہے
زندگانی سے جو تنگ آکے ہے دل گھبراتا
پوچھنے جاتا ہوں مُردوں سے کہ کیا عالم ہے
وصلتِ حور کی حسرت نہ رہے گی آتش!
خلد میراث سمجھ اپنی، بنی آدم ہے

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بُو تیری

یقیں ہے اٹکے گی جاں اپنی آکے گردن میں
سُنا ہے جا ہے قریبِ رگِ گلو تیری

وہ گل ہوں میں کہ ترا رنگ جس سے ظاہر ہے
وہ غنچہ ہوں کہ بغل میں ہے جسکے بُو تیری

پھرے ہیں مشرق و مغرب سے تا جنوب و شمال
تلاش کی ہے صنم! ہم نے چار سُو تیری

شبِ فراق میں اک دم نہیں قرار آیا
خدا گواہ ہے، شاہد ہے آرزو تیری

دماغ اپنا بھی اے گلبدن! معطّر ہے
صبا ہی کے نہیں حصّے میں آئی بُو تیری

پڑھا ہے ہم نے بھی قرآں، قسم ہے قرآں کی
جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بُو تیری

شبِ فراق میں اے روزِ وصل! تا دمِ صبح
چراغ ہاتھ میں ہے اور جستجو تیری

جو ابر گریہ زناں ہے تو برق خندہ زناں
کسی میں خو ہے ہماری، کسی میں خو تیری
یہ چاک جیب کے حق میں دعائے مجنوں ہے
نہ ہو وہ دن کہ درستی کرے رفو تیری
زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زباں
رہے گی معرکے میں آتش! آبرو تیری

نشۂ دولت سے منعم پیرہن میں مست ہے
مردِ مفلس حالتِ رنج و محن میں مست ہے
دَورِ گردوں ہے خداوندا کہ یہ دورِ شراب
دیکھتا ہوں جس کو میں اس انجمن میں مست ہے
ایک ساغر دو جہاں کے غم کو کرتا ہے غلط
اے خوشا طالع جو شیخ و برہمن میں مست ہے

دم بند اس کا زمزموں نے میرے کر دیا
آواز بیٹھ گئی ، ہمصفیر کی

کب تک وہ زلف دیتی ہے آزار دیکھیے
کٹتی ہے کس طرح سے شبِ تار دیکھیے
طاؤس و کبک کو ہے نکل چلنے کا خیال
چلتا ہے یار کون سی رفتار دیکھیے

وہی دے گا کبابِ نرگسی بھی
جو دیتا ہے شرابِ ارغوانی

وہ ترک آیا، لگا اے آتشِ گل !
کبابِ طائرانِ بوستانی

صدمہ ہے دوش پر سر و گردن کے بوجھ سے
ہر ایک بوجھ بھاری ہے سو من کے بوجھ سے
ہوش و خرد ہے باعثِ تکلیفِ آدمی
دیوانہ آشنا نہیں دامن کے بوجھ سے
راحت طلب کو رنج کشوں کی خبر کہاں
آگاہ کیا سوار ہے توسن کے بوجھ سے

غمّازِ اپنا ذکر نہ آوے حضورِ دوست
گردن جھکے نہ منّتِ دشمن کے بوجھ سے
آتش! یہ سارے رنج ہیں اس زندگی کیساتھ
مُردے کو کیا خبر گلِ مدفن کے بوجھ سے

رہ گیا چاک سے وحشت میں گریباں خالی
لے چلے خار سے ہم گوشۂ داماں خالی
وقتِ فرصت کو غنیمت سمجھ آنا ہے تو آ
اے اجل! عالمِ تنہائی ہے میداں خالی
باغِ عالم میں نہیں کوئی کسی کی سُنتا
نہ دماغ اپنا کرا اے مرغِ خوش الحاں خالی
قیدِ مذہب کی گرفتاری سے چھٹ جاتا ہے
ہو نہ دیوانہ تو ہے عقل سے انساں خالی
بُتِ کافر نہیں ہوتے جو ہم آغوش نہ ہوں
بغلِ گور میں ہے جائے مسلماں خالی
ہنستے ہنستے تو کیا قتل گنہگاروں کو
رو دیا دیکھ کے جلاّدتے زنداں خالی

دلِ بے کینہ کدورت نہیں رکھتا آتشؔ !
خس و خاشاک سے ہے اپنے بیاباں خالی

بندِ نقاب عارضِ دلدار توڑیے
باغِ مرادِ عشق کی دیوار توڑیے
وہ دردِ دوست ہیں جو خدا ہم کو زخم دے
سو بار ٹانکے کھائیے سو بار توڑیے
دیکھے ترا جو مصحفِ رو ، برہمن کہے
بُت کو سلام کیجیے ، زنّار توڑیے
مُرغِ ترانہ سنج ہوں اس بوستاں کا میں
خونِ بہار ٹپکے اگر خار توڑیے
انساں کو پاسِ خاطرِ نازک ضرور ہے
شیشہ شراب کا بھی نہ زنہار توڑیے

حسرتِ جلوۂ دیدار لیے پھرتی ہے
پیشِ روزن پسِ دیوار لیے پھرتی ہے
مالِ مفلس مجھے سمجھا ہے جنوں نے شاید
وحشتِ دل سرِ بازار لیے پھرتی ہے

کعبہ و دیر میں وہ خانہ بر انداز کہاں
گردش کافر و دیندار لیے پھرتی ہے
ہنستے ہیں دیکھ کے مجنوں کو گلِ صحرائی
پا برہنہ طلبِ خار لیے پھرتی ہے

رفتگاں کا بھی خیال اے اہلِ عالم! کیجیے
عالمِ ارواح سے صحبت کوئی دم کیجیے
رات صحبت گل سے، دن کو ہم بغل خورشید سے
رشک اگر کیجے تو رشکِ بختِ شبنم کیجیے
اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
رویے کس کے لیے، کس کس کا ماتم کیجیے

اثر رکھتی ہے گلگوں کی کیفیت کا، ہستی ہے
ابھرنے میں حبابِ بحر کے اک جوشِ مستی ہے
غنیمت جان یار آوے لحد پر جان کھونے سے
مرادِ دل ملے کونین تک دے کر تو سستی ہے
ستارہ اپنا گردش میں ہے آتش! اسکی گردش سے
فلک کی تنگ چشمی سے ہماری تنگدستی ہے

کام ہمّت سے جوانمرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے
ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انساں
زہر پی کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے
وہ زبوں بخت شجر ہوں میں کہ دہقاں میرا
بیچھے بوتا ہے مجھے پہلے تبر لیتا ہے
منزلِ فقر و غنا جائے ادب ہے غافل!
بادشہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے
گنجِ پنہاں ہیں تصرف میں بنی آدم کے
کان سے لعل یہ دریا سے گہر لیتا ہے
ضبط کرتا ہے جو نالہ شبِ فرقت میں
زخمِ پہلو میں نمک پیس کے بھر لیتا ہے
عقل کر دیتی ہے انساں کی جہالت زائل
موت سے جان چھپانے کو سپر لیتا ہے
ہجر میں وصل کا ملتا ہے مزا عاشق کو،
شوق کا مرتبہ جب حد سی گذر لیتا ہے
غیرتِ نالہ و فریاد نہ کھوائے آتش!
آشنا کوئی نہیں، کون خبر لیتا ہے

اللہ ری روشنی مرے سینہ کے داغ کی
اندھیاری رات میں نہیں حاجت چراغ کی

بے اعتبار نقش و نگارِ زمانہ ہے
اک رنگ پر ہوا نہیں رہتی ہے باغ کی

سو تاڑ سے بلند کرے باغباں تو کیا
ہمّت کے آگے پست ہے دیوار باغ کی

ابر کرم کے فیض نے ایسا کیا ہے سبز
مہندی کی ٹٹی ہو گئی دیوار باغ کی

کبھی جو جذب محبت سے کام ہوتا ہے
نقاب اُلٹتا ہے دیدارِ عام ہوتا ہے

بلائے بزم جہاں ہے وہ چشم کی گردش
نگاہ پھرتی ہے دورہ تمام ہوتا ہے

الٰہی کیوں نہیں خواہاں کوئی صنم اس کا
یہ دل تو شرط وفا پر غلام ہوتا ہے

کسی کو کیا، کوئی گھر اپنے دل میں کرنے دے
نگیں سے دیکھ لے بر عکس نام ہوتا ہے

فرشتے سنتے ہیں آوازِ "دورباش" کا شور
کبھی ہمارا جو واں اہتمام ہوتا ہے
کوئی زمانے سے جاتا ہے کوئی آتا ہے
کسی کا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے

جمالِ حور و پری پر ہے طعنہ زن مٹّی
بلائے جاں ہوئی سرخ و سفید بن مٹّی
خدا کے واسطے اے آسماں! حوالے کر
دھرے دھرے نہ کہیں ہو مرا کفن مٹّی
ہمیشہ جھاڑتے ہیں گردِ پیرہن! غافل
نہیں سمجھتے کہ ہے زیرِ پیرہن مٹّی
زمانے میں کوئی غربت زدہ نہیں ہم سا
اُڑی نہ اپنے کبھی جانبِ وطن مٹّی
قبولِ خاطرِ مردم ہو توتیا کی طرح
عزیز تیری کریں شیخ و برہمن مٹّی
نہ ہووے قالبِ خاکی غبارِ خاطرِ روح
قبول سینہ کے اوپر ہزار من مٹّی

نظارہ باز یہ در پردہ کون ہے اس کا
دکھاتی ہے کسے چشم و لب و دہن مٹی

مآل کار کا اپنے نہیں خیال آتا
ملایا کرتے ہیں مٹی میں گور کن مٹی

کسی نے اف بھی نہ کی شمع جل کے خاک ہوئی
نہ ہووے گی مگر آتش! یہ انجمن مٹی

طور جس برق تجلی نے کیا خاک سیاہ
تیرے آتشکدۂ حسن کی چنگاری تھی

پیرہن تیرے شہیدوں کے گلستاں ہو گئے
زخم خنداں صورتِ گلہائے خنداں ہو گئے

آرزوئے دل رہی نا آشنائے گوشِ یار
حرفِ مطلب اپنے منہ تک آ کے دنداں ہو گئے

حسن وہ شے ہے کہ پتھر میں بھی کرتا ہے اثر
چشمِ عاشق کی طرح آئینے حیراں ہو گئے

منزلِ دل کی خرابی کا الم کیا کیجئے
کیسے کیسے خانہ آباد ویراں ہو گئے

جو چلن چاہیں چلیں آتشؔ! بتانِ بے وفا
حُسن جب پیدا ہوا سب عیب پنہاں ہو گئے

گور میں بھاگ اہلِ دنیا سے
خلوت اس انجمن سے بہتر ہے
چمنِ دہر کا ہے ہر گل خُوب
نسترن یاسمن سے بہتر ہے
ہنسنے والا نہیں ہے روتے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے
نہیں کھلتا کسی طرح سے بھر
عیب پوشی کفن سے بہتر ہے

صورتِ شمع ہوں ہر چند فروغِ محفل
بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹتی ہے
لاش پر لاش نکلتی ہے ترے کوچے سے
کیا تماشا ہے کہ پھر بھیڑ نہیں چھٹتی ہے
شبِ ہجراں کی درازی کا گلا کیا کیجے
خضر کی عمر بھی دو چار گھڑی گھٹتی ہے

گوش وہ ہے جو سُنا کرتا ہے افسانۂ حسن
وہ زباں ہے جو صنم! نام ترا رٹتی ہے

آنکھ پڑتے ہی قرار و صبر و طاقت لے گئے
خالِ مشکیں دلبری میں گوے سبقت لے گئے

خاک چھانی ہم سبک روؤں نے مثلِ گردباد
وادیِ پُرخار سے تلوے سلامت لے گئے

زہر کھا کر اک شکر لب پر مُوا ہوں دیکھنا
قبر پر دشمن گھڑے بھر بھر کے شربت لے گئے

عالمِ اسباب سے حاصل ہوا آخر کفن
چلتے چلتے آسماں سے ہم بھی خلعت لے گئے

تیرہ بختی کے اثر نے شام سے گُل کر دیا
صبح کو کوّے اٹھا کر شمعِ تربت لے گئے

دیدہ و دل نے گھسیٹا کوچۂ محبوب میں
کھینچ کر مجھکو فرشتے سوے جنت لے گئے

باغِ عالم میں ہے نافہموں کو بے برگی کا غم
سبز بختی اس چمن سے زرد صورت لے گئے

گردشِ چشمِ غزالاں نے ستایا دشت میں
ساتھ اپنے ہر جگہ ہم اپنی قسمت لے گئے
دیکھ سکتے تھے کہاں کافر مسلماں کی نمود
کھود کر تربت ساز آتش آہنگ تربت لے گئے

برنگِ آئینہ انساں کی قسمت ہی اگر سیدھی
موافق ہے زمانہ دوست دشمن کی نظر سیدھی
زمیں پر پاؤں رکھ کر آسماں پر ناز کرتا ہے
مگر ٹھوکر سے چرخِ پیر کی ہو گی نظر سیدھی
نہ پستی و بلندی ہو نہ ایسے بھیڑے کے رستے
عدم کی راہ سب راہوں سے ہو اے بے خبر سیدھی
پس از مردن بھی حسرت باقی رہتی ہے جوانی کی
لحد میں کرتے ہیں پیرانِ خم گشتہ کمر سیدھی
اثر کرتی نہیں تعلیم تیرہ روزگاروں کو
ادھر ٹیڑھی ہوئی شانہ نے کی وہ زلف اُدھر سیدھی
جو منہ میں یار کے آتا ہے بک جاتا ہے اے آتش!
نہ اُلٹی ہی سمجھتا ہے نہ وہ رشکِ قمر سیدھی

کیا سمجھ کر بلبلوں کو حُسن سے اُسکے ہی عشق
چار دن میں رنگِ رخسارِ چمن تبدیل ہے

چلی ہے ایسی زمانے میں کچھ ہوا اُلٹی
کہ سیدھی بات سمجھتے ہیں آشنا اُلٹی
بیانِ حالتِ دل پیشِ یار ہو نہ سکا
زباں کبھی نہ دمِ عرضِ مدعا اُلٹی
خلافِ وضع ہی انساں کے واسطے معیوب
بدن کی زیب نہ ہووے کبھی قبا اُلٹی
شبِ فراق میں میں نے جو منہ لپیٹا ہے
خیالِ وصل میں پھر وں نہیں ردا اُلٹی

قیدِ عفّت میں ہی وہ محبوبِ عاشق جاں بلب
نزع میں بیمار، عیسیٰ دامنِ مریم میں ہی

اُٹھّا نقاب چہرۂ زیبائے یار سے
دیوار درمیاں جو تھی ہم اس کو ڈھا چکے

الٰہی! افعیِ گیسوئے دلستاں کاٹے
اجل کہیں مرے پاؤں کی بیڑیاں کاٹے
برنگِ غنچۂ پژمردہ دل گرفتہ چلے
شگفتہ ہو کے نہ دو دن بھی ہم نے یاں کاٹے
کسی کا ہو رہے آتشؔ، کسی کو کر رکھے
دو روزہ زیست کو انساں نہ رائگاں کاٹے

مردمِ دیدہ رہے سایۂ مژگاں کے تلے
زیست کا لطف ملا خنجرِ بُرّاں کے تلے
دستِ یارانِ وطن سے نہیں مٹی درکار
دب مروں گا کہیں ریگِ بیاباں کے تلے
بختِ بد نے مجھے ہر چند مٹایا آتشؔ!
رہ گیا نام مرا گنبدِ گرداں کے تلے

گرم جوشی نہ کر اے یار! کسی دن یہ نہ ہو
آگ لگ کر مرے گھر غیر کے گھر تک پہنچے
موت ہی آئے جو آنسو نہیں تھمتے یارب!
دامنِ خاک ہی اس دیدۂ تر تک پہنچے

ہر لحظہ دگرگوں ہے مرا حالِ پریشاں
صورت نہیں ملتی مری تصویر میں میری
اس رعشۂ پیری سے تو موت آئی ہی بہتر
دن رات ہے اک زلزلہ تعمیر میں میری

ہر شب شبِ برات ہے ہر روز روزِ عید
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کے
مُنہ ہر نہیں ہوا ہے تجلّی سے طور ہی
ہم بھی ہیں سوختہ تری برقِ جمال کے

رخصتِ یار کا جس وقت خیال آتا ہے
عمرِ رفتہ کو مجھے یاد دلا جاتا ہے
آتشِ گل سے کیا ہی مری طینت کو خمیر
دامنِ بادِ بہاری مجھے بھڑکاتا ہے

آرزو رہ گئی اس کوچے میں پامالی کی
دھوم ہی دھوم فقط چرخِ جفا کار کی تھی

مصلحت تھی وہی جو کچھ کہ کیا جس سی سلوک
دل جو تھا یار کا تھا، جان جو تھی یار کی تھی
راہِ صحرا میں جنوں کیوں نہ رکھے سر گشتہ
جستجو آبلہ پایوں کو ترے خار کی تھی
شب جو تھی پیشِ نظر صورتِ زیبائے حبیب
روشنی گھر میں مرے چاند سی رخسار کی تھی

نازک حباب جو سے بھی میرا مزاج تھا
راس آئی یہ چمن کی نہ آب و ہوا مجھے
کب سے ہوں اشتیاق میں قاتل کے جاں بلب
یادش بخیر بھول گئی ہے قضا مجھے
راز و نیاز کی ہے ترقی وہی ہنوز
صد آفریں ہے یار تجھے، مرحبا مجھے

تری ابروے پیوستہ کا عالم میں فسانہ ہے
کسی استاد شاعر کی یہ بیتِ عاشقانہ ہے
کفن دزدوں میں قبرِ اہلِ دولت کا فسانہ ہے
تمامی کی ہے چادر باولے کا شامیانہ ہے

جو دیوانہ ہے صحرا میں وہ بھاگے میرے سائے سے
سوارِ شیر میں مجنوں ہوں افعی تازیانہ ہے
گریباں پھاڑ کر دیوانہ نے زنجیر کیوں پہنی
کرے کیا عقل دخل اسمیں، جنوں کا کارخانہ ہے
کبھی کچھ ہے تلون سے کبھی کچھ ہے تلون سے
مزاجِ یار بھی نیرنگ سازی میں زمانہ ہے
کہا مجنوں نے دنیا سے گزرنا سُن کے لیلیٰ کا
کوئی آگے روانہ ہے کوئی پیچھے روانہ ہے
سمندِ حسن کو وہ ترک اڑا دے جسقدر چاہے
مزہ مہمیز سے گیسوئے مشکیں تازیانہ ہے
پھرا تا ہے عبث واعظ سر اپنا پاک کے زندوں سے
تکلف برطرف یاں لاابالی کارخانہ ہے
بلند اختر، بلند اقبال قصر یار کو کہیے
ہوائے بام رکھتا ہے وہ عالی آستانہ ہے
وبالِ جاں ہوا ہے جسمِ خاکی ضعفِ پیری سے
قفس سے تنگ بلبل کو خزاں میں آشیانہ ہے
نہ مطلب گشت سے رکھیے نہ خرمن سے غرض آتش!
سمجھ لے اپنے منھ میں مور جو قسمت کا دانہ ہے

عاشق ہوں میں نفرت ہے مرے رنگ کو رُو سے
پیوند نہیں چاکِ گریباں کو رفو سے
دامن مرے قاتل کا نہ رنگیں ہو لہو سے
ہر چند کہ نزدیک ہو رگہائے گلو سے
گلزارِ جہاں پر نہ پڑی آنکھ ہماری
کوتاہ تھی عمر اپنی حبابِ لبِ جو سے
کرتا ہے وہ سفاک خطِ شوق کے پُرزے
مہندی مِلی جاتی ہے کبوتر کے لہو سے
منہ پھیرتے ہی یار کو صورت بھی گئی بھول
ہم چشمِ وفا رکھتے ہیں اس آئنہ رُو سے
عاشق ہوں مگر کرتے ہیں معشوق خوشامد
نازک ہے طبیعت مری بیمار کی خو سے
کشتہ ہوں میں بیزاریِ جلّاد کا آتشؔ!
تلوار نہیں رنگ پکڑتی ہے لہو سے

ہو کبھی تو سببِ خیر عدو اپنا بھی
نشۂ حسنِ الٰہی اسے مدہوش کرے

اِس تماشے کی ہیں مشتاق ہماری آنکھیں
کبک ٹیڑھا چلے سیدھا تری پاپوش کرے

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش!
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

کنجِ تنہائی میں رہتا ہے نہایت دل تنگ
چار دیوار گرا کر اسے میداں کرتے

بیوفائی کا اگر عیب نہ ہوتا تم میں
اے بتو! سجدہ خدا کو نہ مسلماں کرتے

دمِ شمشیر کی موجِ نفس میں یاں روانی ہے
گلے تک حسرتِ جلاّد میں لوہی کا پانی ہے
دلِ نازک نہیں متابِ جمالِ یار لائے گا
مجھے پردے میں عزرائیل کو صورت دکھانی ہے
شبِ فرقت نہیں یہ واسطے شبنم بچانے کے
سیہ بختی نے کملی میرے سر پر لاکے تانی ہے
الٰہی طولِ عمرِ خضر دے بادِ بہاری کو
مزارِ بیکساں پر پھولوں کی چادر چڑھانی ہے
ارادہ عرشِ اعظم کا ہے آہِ صبحگاہی کو
درِ فریادرس پر چل کے اب دھونی لگانی ہے

سینے پر سنگِ ملامت جو گراں جاں روکے
گرزِ رستم کو یقیں ہے کہ وہ انساں روکے
بلبلوں کے لیے ہے دامِ رگِ گل باقی
جال پھیلا کے نہ صیاد گلستاں روکے
شوقِ صحرا سے نہیں پاؤں زمیں پر پڑتے
کس کو ٹھہرائے اُلجھ کر کسے داماں روکے

بخشے جاویں گے گنہگارِ محبّت اے صنم!
رحمتِ اللہ سے کافر ہے جو مایوس ہے

اللہ رے تکلّفِ ساقی بہار میں
مے کی گلابیاں ہیں مرصع کے کام کی

کیا اپنی انجمن میں صبا کو میں راہ دوں
گلبوں میں بوئے خلوتِ خاص اس نے عام کی

خطِّ سیہ ہوا رخِ پُرنور رشکِ باغ
صبحِ بہار سبزۂ نورس نے شام کی

اصلاح لینے آتے ہیں رنگیں خیال لوگ
خدمت ہے اس چمن میں مجھے انتظام کی

سر ٹوٹے محتسب کا جو اِس میکدہ میں آئے
جام آہنی صراحی ہے سنگِ رخام کی

اللہ رے پھڑکنا اسیرانِ تازہ کا
صیّاد خیر مانگتا ہے اپنے دام کی

مضموں کا چور ہوتا ہے رُسوا جہان میں
چکّھی خراب کرتی ہے مالِ حرام کی

آتش! کمالِ مہدیِ دیں کا ہے اشتیاق
آنکھوں کو آرزو ہے ظہورِ امام کی

سُرخیِ پاں ہے لعلِ مسی زیبِ یار پر
پھولی شفق دیارِ بدخشاں کی شام کی

گھر سے خدا کے ملتے ہیں مضموں مجھے بلند
فکرِ رسا کمند ہے کعبے کے بام کی

باغِ جہاں میں گل کی قناعت سے جائے رشک
عمرِ دو روزہ ایک قبا میں تمام کی

بیمارِ عشق ہوں مجھے عیسیٰ جواب دے
کانوں کو آرزو ہے اجل کے پیام کی

پیدا نہ ہوگا دوسرا مجھ سا شراب خوار
مٹی خراب ہوگی مرے بعد جام کی

مُنہ دکھاؤ بہت رہی تکرار
ارنی اور لن ترانی کی

جس کو کہتے ہیں چودھویں کا چاند
تیری تصویر ہے جوانی کی

سیر نعمت سے دو جہاں کی، کیا
دے کے شبنم کو بوند پانی کی
راحتِ مرگ کو نہ پوچھ آتش!
نہ رہی قدر زندگانی کی

واقف خزاں ہوئی نہ ہماری بہار سے
بدلا نہ رنگ نشّے نے اپنے خمار سے
بعدِ فنا وصال ہوا ہم کو یار سے
توڑا طلسمِ ہجر کو لوحِ مزار سے
توڑوں وہ گل جو سرخ ہو رُوئے نگار سے
کاٹوں میں سرو کو جو بڑھے قدّ یار سے
خاموش دیکھتا ہوں گل و سرو کی بہار
حیراں میں ہوں زمانے کے نقش نگار سے
عشرت کدہ ہے تیغ سے قاتل کی قتل گاہ
زخموں کی بدّھی ملتی ہے پھولوں کے ہار سے
بعدِ فنا قبول نہیں ذکرِ نیک و بد
مٹ جائے پہلے نام، نشانِ مزار سے

سمجھے تو رنج و راحتِ بلبل ہے مدعا
اس مطلعِ دولختِ خزان و بہار سے
بیہودہ خاک اڑانے سے کیا حاصل اے صبا!
ناوک فگن سوار ہو پیدا غبار سے
رکھدیں برہنہ گور میں اہلِ جہاں مجھے
دس گز کفن قبول نہیں روزگار سے

بہار آئی، چھکا ساقی شرابِ روح پرور سے
خزاں کا غم بھلادے بادۂ گلگوں کے ساغر سے
صفائے قلب کو حاصل کیا میں نے مقدر سے
یہ آئینہ مرے ہاتھ آگیا بختِ سکندر سے
نگاہِ ناز کا سائل ہوں خوبانِ ستمگر سے
قضا کے تیر کا مشتاق ہوں ترکوں کے لشکر سے
نہ خط لیجائے میرا تا کوئی پھر جان کے ڈر سے
جوابِ نامہ لکھا یار نے خونِ کبوتر سے
پھنسایا چاہتا ہے باغباں بلبل کو پھندے میں
کمر بندھوائی ہے صیاد کی پھولوں کی چادر سے

قفس میں بھی بہارِ باغ سے حاصل حضوری ہے
چمن کی سیر کر لیتا ہوں میں دل کی صنوبر سے
وہ ماتم دوست ہوں رویا کیا ہوں رات بھر آتش!
چراغِ گور اگر گل ہو گیا ہے بادِ صرصر سے

وہی چتون کی خونخواری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
تری آنکھوں کی بیماری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
وہی نشو و نمائے سبزہ ہے گورِ غریباں پر
ہوائے چرخِ زنگاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
وہی سر کا پٹکنا ہے وہی رونا ہے دن بھر کا
وہی راتوں کی بیداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
رواجِ عشق کے آئیں وہی ہیں کشورِ دل میں
رہ و رسمِ وفا جاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
وہی جی کا جلانا ہے، پکانا ہے وہی دل کا
وہ اسکی گرم بازاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

نیازِ خادمانہ ہے وہی فضلِ الٰہی سے

بتوں کی ناز برداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی سودائے کاکل کا ہے عالم جو کہ سابق تھا

یہ شب بیمار پر بھاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی بازار گرمی ہے محبت کی ہنوز آتش!

وہ یوسف کی خریداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

انتخابِ غالب

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ "رفت" گیا اور "بود" تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں، ورنہ، ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

دوست دارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پُر افشاں نکلا

بوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ، تھا مائدۂ لذّتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

ہے نو آموزِ فنا، ہمّتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

عرض کیجے، جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے "کیا"

حضرتِ ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا! یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھُٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اِس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ!
ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان، غالبؔ!
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہَوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مَرنا تو جینے کا مزا کیا

تجاہل پیشگی سے مُدّعا کیا
کہاں تک اے سراپا نازؔ کیا کیاؔ

نوازشہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گِلا کیا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا

بلائے جاں ہے غالبؔ اُسکی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار، بُرا کیا ہے، گر اچھّا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش! کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

تمنّائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
اک تماشا ہوا، گِلا نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما
کام گر رُک گیا، روا نہ ہوا

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا کہ ہمیشہ نہیں "اچھا کوئی دن اور"

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گذارا کوئی دن اور

نا داں ہو جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہو غالبؔ!"
قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تُو اور آرایشِ خمِ کاکُل
مَیں اور اندیشہ ہائے دور دراز
لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ الفتِ صیّاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے
ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز
اے ترا غمزہ، یک قلم انگیز
اے ترا ظلم، سر بسر انداز
مجھکو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تُو غریب نواز
اسدؔ اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِؔ وحشی، ہے ہے
بیٹھنا اُس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ!
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گُہر ہوتے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہوتے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ! کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا! نہ مانگ

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
خوش حال اس حریفِ سیہ حال کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گُل، سر بپائے گُل
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے نفَسِ عطر سائے گُل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفَس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ!
جانتے ہیں سینۂ پُر خوں کو زنداں خانہ ہم

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کِسے
ذوقِ نظّارۂ جمال کہاں

دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خطّ و خال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ایسا آساں نہیں، لہو رونا
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں

ہم سے چھوٹا قمارخانۂ عشق
واں جو جائیں، گرہ میں مال کہاں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
مَیں کہاں اور یہ وَبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ!
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کی وفا ہم سے تو غیر اسکو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مئے و نغمہ کو 'اندوہ رُبا' کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے، ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم 'نامِ خدا' کہتے ہیں

وحشتؔ و شیفتہؔ اب مرثیہ کہویں شاید
"مر گیا غالبِؔ آشفتہ نوا" کہتے ہیں

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں تنگ پیراہن جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

بس کہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھکو، ستم گر! ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہو پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں،
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل! غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ! پیش دستی ایک دن

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں"
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مرے پانوں میں زنجیر نہیں

جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالبؔ! اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں"

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

ہے تجلّی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں "جیتے ہیں اُمّید پہ لوگ"
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں
ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری!
تجھے کِس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ!
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دَورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

غالبؔ! چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سُوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
غالبؔ! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہمکو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

ہوں ظہوریؔ کے مقابل میں خفائیؔ غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

سبدِ گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ! کہ گلزار میں صیّاد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ!
تمکو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں؟

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہَوا باندھتے ہیں

تیری فرصت کے مقابل، اے عمر!
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

نقشۂ رنگ سے ہے واشدِ گُل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں!
آبلوں پر بھی حِنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں، غالب!
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
غالبؔ! وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دُعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم مُوحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
مِلتّیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہی رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ، تو اے اہلِ جہاں!
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

دیوانگی سے دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں
طاقت بقدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

ڈر نالہائے زار سے میرے، خدا کو مان

آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے رُوکشی

حالانکہ طاقتِ خلشِ یار بھی نہیں

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا

دیوانہ گر نہیں ہے تو ہُشیار بھی نہیں

اسدؔ زندانیِ تاثیرِ اُلفت ہائے خوباں ہوں

خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

مگر غبار ہُوئے پر، ہوا اُڑا لے جائے

وگرنہ تاب و تواں، بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے

کہ غیرِ جلوۂ گُل رہ گذر میں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا

اثر مرے نفَسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ!
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی
جسکو ہو دین و دل عزیز، اسکی گلی میں جائے کیوں
غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

وارستہ اس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبّت ہی کیوں نہ ہو
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں، ہر درد کی دوا
یوں ہو، تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو
ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے، نوا سنجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

وفاداری بشرطِ استواری، اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں، تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اللہ رے شوقِ دشت نوردی، کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانوٗ

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانوٗ

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دُکھتے ہیں آج اس بُتِ نازک بدن کے پانوٗ

غالبؔ! مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانوٗ

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ اُمّید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سَم ہے ہم کو

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرّر چاہا
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کُھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالبؔ ! ولے بقولِ حضور
"فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو"

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل ! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم !
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو
کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رُسوائی"
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ "ہاں کیوں ہو"
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تُو غالبؔ !
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اٹھائیے!

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ، قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گُل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مےِ ذات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ! فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مےِ عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ! شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا
یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد!
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے
بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
ہرچند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ! ترا احوال سُنا دینگے ہم اُن کو
وہ سُن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی
ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا، ظالم! مگر تمہید جانے کی

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے
حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہے
کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی ،
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

گرشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ!
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا ، زمین کو عرقِ انفعال ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ!
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کسکو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغ کُشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دُودِ چراغِ کُشتہ ہے

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رُسوائی
اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبّت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آ گہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف!
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ!
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ڈھونڈھے ہے اُس مغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

کرتا ہے بس کہ باغ میں تُو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے

کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

زندگی اپنی جب اِس شکل سے گزری غالبؔ!
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہُوا کیے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجّادہ رہنِ مے
مدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

بے صَرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ "ہم کیا کیا کیے"

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ "اے لئیم
تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے"

ضد کی ہے اور بات مگر خُو بُری نہیں
بھُولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

غالبؔ! تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؟
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

میں نامُراد دل کی تسلّی کو کیا کروں؟
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسدؔ! مسرّتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

غیر کو یا رب! وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دَم لینے سے گھبرا جائے ہے

دُور چشمِ بد، تری بزمِ طرب سے، واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رُخ، اور نازک بن گیا
رنگ کھُلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مُصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم!
لے لیا مجھ سے، مری ہمّتِ عالی نے مجھے
ہوسِ گل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذّت، کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کی برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
بس، ہجومِ نا اُمیدی، خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذّتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا! ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظّارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانہ نے اسداللہ خاں! تمہیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خُلد میں تری صورت مگر ملے

اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امّید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

"ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا"

اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ!
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جُویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم، دلّالِ جنسِ رُسوائی
دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بیقراری ہے

پھر اُسی بے وفا پہ مَرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر کھُلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشک باری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدّمہ تھا
آج پھر اس کی رُوبکاری ہے

بےخودی بےسبب نہیں غالبؔ!
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر، موجِ آب کو، فرصت روانی کی

پر پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض، کیا قدرت!
کہ طاقت اڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
کہاں تک روؤں اسکے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب! کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر!
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علَم ہوئے
چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سَحَر، سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال، نہ نظّارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق! یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار، اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہی

ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مُطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہی

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہی

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہی

یا صبحدم جو دیکھیے آ کر، تو بزم میں
نے وہ سرور و سُور، نہ جوش و خروش ہی

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہی

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ! صریرِ خامہ نوائے سروش ہی

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچّھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچّھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہی ہر لحظہ نگاہ

جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جسکو نہ ہو خُوئے سوال اچھا ہے

اُنکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بُتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب! یہ خیال اچھا ہے

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستایش کی تمنّا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ! اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے
پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
گو سمجھتا نہیں، پر حُسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

رکھیو غالبؔ! مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مشک بُو کیا ہے
پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے
ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاشکے! تم مرے لیے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتکھنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا، کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

عشق نے غالبؔ! نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک!
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا رُوئے آب پر کائی

سبزہ و گل کو دیکھنے کے لیے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ!
شاہِ دیندار نے شفا پائی

رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ!
دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ!
ننگِ پیری ہے جوانی میری

تُو وہ بد خو کہ تحیّر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
وہ تپِ عشقِ تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اُسے قسمت میں عدُو کی
صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے، غالبؔ!
حسرت میں رہے ایک بُتِ عربدہ جُو کی

آغوشِ گُل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

ہے وصل، ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

ہر قدم دُوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ!
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

پلا دے اوک سے ساقی! جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے
گر باغ گدائے مے نہیں ہے
ہرچند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہرچند کہیں کہ "ہے"، نہیں ہے
کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد!
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھدیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ! یوسفِ ثانی مجھے

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمایش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمایش ہے
قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمایش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے
نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بُوئے پیرہن کی آزمایش ہے
نہیں کچھ سبحہ و زُنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمایش ہے

گو ہاتھ میں جُنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ!
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طُرّۂ لیلا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
ٰسر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ!
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ!
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اسمیں دم کیا ہی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہے گا اسکی گردن پر
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
محبّت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ! اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

جُز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سی چاک ہی

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ!
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

ہے ذرّہ ذرّہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب
اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے
بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گذر نہ کر
ہر ذرّے کے نقاب میں دل بیقرار ہے
اے عندلیب! اک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے برگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

غالبؔ! بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے اِن بُتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اِس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی
غالبؔ! اگر اِس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمک داں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظّارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

غالبؔ! ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کیلیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رُوشناسِ خلق اے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے
فلک نہ دُور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے
دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کے لیے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لیے

ہاں مہِ نو! سُنیں ہم اُس کا نام
جسکو تو جُھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب
"بندہ عاجز ہے، گردشِ ایام"

اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سُرورِ خاصِ خواص
حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام

عُذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور تیرا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھُپاتا ہے
مجھکو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے اُمید گاہِ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تُو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ!
قُربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھکو کیا پایہ رُوشناسی کا
جُز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تُو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، مَیں کون؟
مجھکو کیا بانٹ دے گا تُو انعام
میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مےِ گلفام
جبکہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکے قطع تیری تیزیِ گام
تیرے پَرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کِس نے کہا کہ ہو بدنام
مَے ہی پھر کیوں نہ مَیں پیے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دُشنام
کعبہ میں جا بجائیںگے ناقوس
اب تو باندھا ہے دَیر میں احرام
اِس قدح کا ہے دَور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سی گردشِ دام
بوسہ دینے میں اُنکو ہے انکار
دل کے لینے میں جن کو تھا اِبرام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصّہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف
نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیِ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف، زندگی افزا
اے ترا عہدِ فرّخی فرجام
چشمِ بد دور، خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ! عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
جُرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تُور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گُودرز و بیژن و رُہّام
مرحبا! مُوشگافیِ ناوک
آفریں! آبداریِ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

ق

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام
فنِ صورت گری میں تیرا گذر
گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور اُن اوراق میں بکلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کُش
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گرد، نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

○